طلوعِ اسلام

جنوری ۱۹۵۳ء

مقالہ خصوصی
بنیادی اصولوں
کی رپورٹ پر
تبصرہ

-/10/

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	خورشید عالم	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۶	جنوری ۱۹۵۳ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا	۳
لمعات	۵-۹
بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ پر تبصرہ	۱۰-۲۶
سلیم کے نام . . .	۲۷-۳۵
(محترم پرویز صاحب)	
استوانۃ المصحف	۳۶-۵۰
(علامہ تمنا عمادی)	
خطبہ تقسیم اسناد	۵۱-۵۵
(ہز اکسلنسی ڈاکٹر عزام بے سفیر مصر)	
یہودیوں کی حکومت	۵۷-۷۰

آپ کے اور آپ کی آنیوالی نسلوں کے مستقبل

کا انحصار پاکستان کے اس آئین پر ہے جو آجکل مرتب ہو رہا ہے۔ اگر یہ آئین قرآن کریم کے اصولوں کے مطابق بن گیا تو آپ کی یہ دنیا بھی سنور جائے گی اور آخرت بھی۔ لیکن اگر یہ دستور غیر قرآنی خطوط پر تشکل ہو گیا تو آپ کی یہ زندگی بھی جہنم کی ہو جائے گی اور عاقبت کی رسوائی اس سے الگ ہو گی۔

اسوقت کرنے کا کام یہ ہے

کہ قرآن کے ان اصولوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دیا جائے جن کے مطابق آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور مرتب ہو، اس مقصد کے لئے ادارۂ طلوع اسلام نے

قرآنی لٹریچر

شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسوقت دو کتابیں "اسلامی نظام" اور "قرآنی دستور پاکستان" شائع ہو چکی ہیں۔ آپ صرف اتنا کیجئے کہ ان کتابوں کے کچھ نسخے اپنے پاس منگا کر رکھ لیجئے۔ یہ کتابیں لوگوں کو اس شرط پر پڑھنے کے لئے دیدیجئے کہ وہ اگر رکھنا چاہیں تو آپ کو ان کی قیمت دیدیں اور اگر نہ رکھنا چاہیں تو ایک ہفتہ کے بعد کتاب واپس دیدیں۔

دو مہینے کے اندر اندر

آپ کے پاس جسقدر کتابیں باقی بچیں انھیں ہمارے پاس واپس بھیجدیں۔ آپ کو ان کی قیمت واپس دیدی جائیگی۔ اس طرح

آپ کا کچھ خرچ نہیں ہو گا

اور یہ قرآنی لٹریچر بہت سے لوگوں تک پہنچ جائے گا۔ بہت جلد لکھئے کہ آپ کو کتنی کتابیں بھیجی جائیں۔ اسلامی نظام کی قیمت دو روپے اور قرآنی دستور پاکستان کی قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک ہے۔ آپ کو کتابیں بذریعہ وی پی بھیجی جائینگی اور جو کتابیں آپ واپس کریں گے ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر آپ کو ادا کر دی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
بندر روڈ (چوک سول ہسپتال) کراچی

تبدیلیٔ پتہ نوٹ کر لیجئے

قرآن نے کیا کہا؟

مہاتما بدھ نے کہا کہ اس دنیا میں جس قدر مصیبتیں بھگتی جا سکتی ہیں بھگتو۔ جس قدر تکالیف اٹھائی جا سکتی ہیں اٹھاؤ۔ مرنے کے بعد تم "یم لوک" (عالم بالا کی مملکت) میں پہنچ جاؤ گے جہاں تمہیں نروانا (کامل سکون) حاصل ہو جائے گا۔

(۲) ہندو مت نے کہا کہ دنیا مایا (فریب کا جال) ہے۔ اس سے جس قدر دور رہا جا سکے، بہتر ہے۔ سنیاس آشرم (جس میں انسان گھر بار تیاگ کر جنگلوں میں چلا جاتا ہے) مکتی (نجات) کے لئے ضروری ہے۔

(۳) افلاطون نے کہا کہ دنیا طلسم اور وہم و فریب ہے۔ اس کی ہستی کے متعلق۔ ہر چند کہیں کہ ہے، ہیں ہے۔ یہی فلسفۂ اشراق ہے جو دنیا میں تصوف کے نام سے مشہور ہے۔

(۴) عیسائیت نے کہا کہ دنیا ذلیل ہے اور دولت، خدا کی لعنت۔ آسمان کی بادشاہت غریبوں اور مفلسوں، ناداروں اور کنگالوں کے لئے ہے۔

لیکن

قرآن نے کہا کہ

دنیا کی دولت اور ثروت۔ قوت اور اقتدار خدا کی نعمت ہے۔ یہاں کی زیب و زینت انسان کے لئے وجہ جاذبیت ہے۔ کون ہے جو ان حسین و خوش آئند چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

دنیا کی خوشحالی، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ بھوک اور خوف، مفلسی اور ناداری خدا کا عذاب ہے۔

جس کی دنیا کی زندگی خوشگوار نہیں اس کی عاقبت بھی درست نہیں ہو سکتی، آج کا اندھا، کل بھی اندھا ہوگا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

بنیادی اصولوں کی دوسری رپورٹ بالآخر منظر عام پر آگئی۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس رپورٹ میں ان بنیادی اصولوں کو متعین کیا گیا ہے جن کے مطابق (کمیٹی کی سفارش ہے کہ) مملکت پاکستان کے آئین کی جزئیات مرتب کی جائیں اگر مجلس آئین ساز نے ان اصولوں کو تسلیم کر لیا تو اس کے بعد فقط اتنا کام باقی رہ جائے گا کہ ان اصولوں کے مطابق عملی تفصیلات مرتب کر لی جائیں اور انہیں قانونی زبان میں منضبط کر لیا جائے اسی کا نام مملکت پاکستان کا دستور ہوگا۔ اور یہی وہ قالب ہوگا جس کے مطابق آپ کی اور آپ کی آنیوالی نسلوں کی زندگی کی ممکنات صورت پذیر ہوں گی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مذکورہ صدر رپورٹ کے اصولوں کو کس قدر اہمیت حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم سابقہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں) پاکستان کی اصلی تشکیل کا وقت اب ہی آیا ہے۔ اس سے پہلے ہمیں صرف ایک خطۂ زمین ملا تھا جس کا نظم و نسق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق سرانجام پا رہا تھا۔ اب وہ وقت آیا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ

ثم جعلنکم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون ۞ (۱۰/۱۴)

پچھلی قوموں کے بعد پھر ہم نے تمہیں زمین میں ان کا جانشین بنا دیا۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔

دستور سازی کا کام اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یہ کام نہایت پرسکون ماحول اور سنجیدہ فضا میں ٹھنڈے دل سے کیا جائے۔ اس میں ذہنی میلانات اور قلبی رجحانات کا کوئی دخل نہ ہو۔ آئین بنانے والوں کے جذبات کو اس طرح متاثر نہ کیا جائے کہ وہ کسی خاص اثر سے خائف اور مرعوب ہو جائیں یا کسی خاص جاذبیت کی طرف جھک جائیں۔ ان کے سامنے کچھ متعین، واضح اور غیر متبدل اصول ہونے چاہئیں جن کی روشنی میں وہ خالی الذہن ہو کر (Objectivly) آئینی خط و خال مرتب کر سکیں۔

ہم نے حصول پاکستان کی تحریک کے دوران میں اپنی کچھ آرزوؤں کا اظہار کیا تھا کچھ مخصوص تقاضوں کو دہرایا تھا۔ اپنے کچھ امتیازات اور خصائص پیش کئے تھے۔ ہمارے کچھ دعاوی تھے، کچھ مواعید، ان تمام کی بنیادوں پر ہم نے اپنی جداگانہ مملکت کے دعوے کی عمارت اٹھائی تھی۔ یہ دعاوی اور تقاضے اس قسم کے تھے کہ ہم اپنا جداگانہ نظریۂ زندگی رکھتے ہیں۔ ہمارا نصب العین حیات اوروں سے الگ ہے۔ ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن ایک جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ ہماری زندگی کے مقاصد دوسروں سے الگ تھلگ ہیں۔ ہم انہی کی تکمیل کیلئے ایک جداگانہ مملکت چاہتے ہیں۔ ہمارے انہی دعاوی کی بنیاد پر ہمیں الگ خطۂ زمین ملا اور ان آرزوؤں کی تکمیل کا وقت آگیا جن کی خاطر ہم نے اس زمین کو حاصل کیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے آئین کے اصول مرتب کرنے سے پہلے اس چیز کو متعین کر لیتے کہ جس نصب العین حیات کو ہم اس طرح دہراتے چلے آرہے تھے اس سے مفہوم کیا ہے۔ ہماری زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ وہ کونسی آرزوئیں ہیں جن کی تکمیل کی خاطر ہم نے

اس خطۂ زمین کو حاصل کیا ہے۔ یعنی وہ نقشہ کونسا ہے جس کے مطابق ہمیں اس زمین پر اپنا مکان بنانا ہے۔ ہم نے یہ کچھ نہ کیا اور سیدھے منہ گئے آئین کے اصول مرتب کرنے کیلئے۔ یہ ہماری دستور سازی کی کوششوں کا بنیادی نقص تھا۔ آپ کہدیں گے کہ ان چیزوں کے متعین کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ وہ مقصد جس کیلئے ہم نے پاکستان کی زمین حاصل کی تھی ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ لفظ ہے "اسلام"۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ اسی ایک لفظ کے اندر آجاتا ہے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے ہر فرد کے ذہن میں اسلام کا جداگانہ مفہوم (اور پاکستان کے مسلمانوں ہی کی کیا تخصیص ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہی حال ہے) جیسا کہ ہم نے زیرِ نظر رپورٹ پر تبصرہ میں لکھا ہے آپ ہر مسلمان کو کاغذ پنسل دیدیجئے اور ان سے کہئے کہ وہ اس سوال کا جواب لکھیں کہ "اسلام کیا ہے؟" آپ دیکھیں گے کہ شاید ننانوے فیصدی لوگ ایسے ہوں گے جو اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں لکھ سکیں گے اور بقایا ایک فیصدی میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ جب اسلام کے مفہوم میں ہمارے اختلافات کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے کہ ایک اسلامی دستور کس طرح سے مرتب ہو سکتا ہے۔ جب تک آپ پہلے اسلام کے مفہوم کو متعین نہ کرلیں کوئی چیز جس کے نام کے ساتھ اسلامی لگا ہوا ہو متعین کی ہی نہیں جا سکتی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے یہ تھا وہ بنیادی نقص جسے وضع دستور سے پہلے دور کرلینا نہایت ضروری تھا۔ اس بنیادی نقص کے ساتھ ایک بہت بڑی بدقسمتی بھی شاملِ حال تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں ایک پارٹی کی داغ بیل ڈالی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ

> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لیکر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کرکے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرلے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء)

اس زمانہ میں حصولِ پاکستان کی تحریک جاری ہوئی اور اس نے عوام میں مقبولیت حاصل کرنا شروع کردی۔ چونکہ اس تحریک کی مقبولیت اس پارٹی کے عزائم کے خلاف تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسلئے اس کے داعی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے پاکستان کے تصور کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیا۔ وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد ایک خالص سیاسی لیڈر کی طرح جس کا ضمیر اسے کبھی اس بات پر ملامت نہیں کرتا کہ میں کل تک کیا کہہ رہا تھا اور آج کیا کر رہا ہوں۔ پاکستان میں آگئے اور اپنے مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لئے نئی تدبیریں کرنے لگے۔ ان سب میں مؤثر تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ اس چیز کا نعرہ لگایا جائے کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہونا چاہئے۔ اس نعرہ کی داغ بیل بہت سوچ سمجھ کر ڈالی گئی تھی۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اسلام کا کوئی مفہوم متعین ہی نہیں کیا گیا تھا اسلئے اس نعرہ میں یہ گنجائش موجود تھی کہ حکومت کی طرف سے جو دستور بھی پیش ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ یہ اسلامی نہیں۔ اُدھر یہ نعرہ بلند کیا اور اِدھر لوگوں میں اس خیال کو از سرِ نو عام کرنا شروع کردیا کہ یہ علماء کا حق ہے کہ وہ بتائیں کہ کونسا دستور اسلامی ہے اور کونسا غیر اسلامی۔ اس طرح سے اس رپورٹ کے مرتب ہونے سے پہلے ہی ایسی فضا پیدا کردی گئی کہ لوگ حکومت کی بات کو (وہ کچھ بھی کیوں نہ ہو) غیر اسلامی تصور کریں اور اس پارٹی کی بات کو جس کے عزائم اوپر نقل کئے گئے ہیں اسلامی قرار دے لیں۔ اس پارٹی کے داعی اپنے مصالح کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلتے چلے آرہے ہیں کہ اگر

(جزئیات نہیں بلکہ خود مذہب کے متعلق اصولوں تک میں) ان کے تضادات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا کوئی شخص اس قدر تضاد بیانیوں کے باوجود ..... لوگوں کے سامنے آنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا سیاست میں یہ سب کچھ روا ہے۔ جب مقصد یہ ٹھہرا کہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کر کے حکومت کی مشینری پر قابض ہونا چاہئے تو پھر حصولِ طاقت میں اصول کی نگہداشت کے کیا معنی؟

اس پارٹی نے اس طرح نازیانہ انداز سے شور مچایا کہ جو لوگ وضع آئین کے لئے مامور ہوئے تھے وہ بوکھلا اٹھے۔ زیر نظر رپورٹ اس بوکھلاہٹ کی صاف غمازی کر رہی ہے اور یہی ہے وہ ہماری بدقسمتی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

جس وقت یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں ہمارے سامنے کسی پارٹی کا ردِ عمل نہیں آیا اس لئے یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اندازہ یہی ہے کہ مذکورہ صدر پارٹی ضرور کہہ دیگی کہ یہ آئین اسلامی نہیں حالانکہ اس رپورٹ میں وہ سب کچھ موجود ہے جس[1] کا مطالبہ علما حضرات کی طرف سے کیا جا رہا تھا اس رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ

(۱) کوئی قانون ایسا پاس نہ کیا جائے جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔

(۲) زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کی جائے۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

(۴) مرکز اور صوبوں کی مجالس مقننہ کے ساتھ علماء کی مجالس مقرر کی جائیں جن سے استصواب کیا جائے کہ فلاں اختلافی معاملہ میں قرآن و سنت کا کیا حکم ہے۔

آپ فرمائیے کہ مولوی صاحبان کے مطالبہ میں کونسی بات ایسی تھی جو مجموعی حیثیت سے ان سفارشات میں نہیں آجاتی لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ یہ پارٹی ان سفارشات سے کبھی مطمئن نہ ہوگی اس لئے کہ ان کے نزدیک اسلامی نظام صرف وہ ہے جسے یہ اسلامی کہدیں اور اس کی دلیل وہ پہلے دے چکے ہیں کہ قرآن تو مبہم سی کتاب ہے جو احادیث کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی اور احادیث کے مجموعوں میں غلط اور صحیح سب قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔ اور یہ چیز ایک مزاج شناس رسولؐ ہی بتا سکتا ہے کہ صحیح حدیث کونسی ہے اور غلط کونسی ہے۔ جب حدیثوں کے متعلق مزاج شناس رسولؐ کی یہ پوزیشن ہے تو فقہی مسائل کے اختلاف میں اسکی رائے سے فائق رائے کس کی ہو سکتی ہے۔

ابھی ابھی اخبارات میں دیکھا کہ مودودی صاحب نے کراچی کے ایک جلسہ میں (رپورٹ شائع ہونے سے پہلے) فرمایا کہ یہ نظام اس لئے غیر اسلامی ہے کہ اس میں صوبائی تفریق برقرار رکھی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ کہہ رہے ہیں جن کے متفقہ مطالبہ میں یہ موجود ہے کہ مسلمانوں کے مسلمہ مذہبی فرقوں کو نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ مراعات بھی دی جائیں۔ ان کے نزدیک صوبائی تفریق غیر اسلامی ہے اور مذہبی تفریق

---

[1] واضح رہے کہ مودودی صاحب نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا کہ مجھے گروہ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے اور نہ ہی میں اس گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں۔ (ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۵ھ) لیکن اکتیس علماء کی طرف سے جو مطالبہ شائع ہوا تھا اس میں مودودی صاحب پیش پیش ہیں اور اس مطالبہ کو سراپا خیر قرار دے رہے ہیں اگرچہ ان سے الگ ہٹ کر خود اپنا آٹھ نکاتی مطالبہ اس کے بعد شائع کر چکے ہیں۔ سیاست کے ہتھکنڈے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔

عین اسلام حالانکہ مذہبی فرقہ بندی کو قرآن کھلے الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے۔ بہرحال انھیں تو ہر اس چیز کو غیر اسلامی کہنا ہے جو ان کی مصلحت کے خلاف ہو۔

اب رہا طلوع اسلام سو اس کے نزدیک اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار نہ حکومت کے ایوان کا کوئی متفقہ فیصلہ ہے نہ اکتیس چھوڑ اکتیس ہزار علمائے کرام کا کوئی متفقہ مطالبہ اس کے نزدیک اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار فقط اس خدا کی کتاب جس نے اسلام کو ہمارے لئے دین تجویز کیا اور اسے اپنی کتاب کے اندر مکمل کر دیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ اس معیار کے مطابق ہمارے نزدیک نہ تو علماء کا مطالبہ اسلامی تھا اور نہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی یہ سفارشات اسلامی ہیں۔ (واضح رہے کہ کسی دستور کی جزئیات کو الگ الگ اسلامی یا غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام ایک غیر منقسم وحدت ہے جس کا حکم کُل پر لگتا ہے اور آئین کی صورت میں تو یہ شرط اور بھی بنیادی ہو جاتی ہے) اسلام کی ساری عمارت وحدت کے تصور پر اٹھتی ہے۔ سب سے پہلے خدا کی وحدت جس کے معنی عملی زبان میں قانون کی وحدت ہے یعنی تمام ملت کے لئے ایک قانون اور اس کا ایک ہی ضابطہ ہو، یہ ضابطہ ہے قرآن۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں قرآن کوئی "گُپت وِدِیا" (باطنی علم) نہیں جو محض کسی مخصوص طبقہ ہی کے سمجھنے کی چیز ہو۔ اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی الجھاؤ ہے، نہ پیچیدگی، نہ ابہام ہے، نہ اختلاف، صاف، سادہ، سلیس، عربی زبان میں واضح اور بین قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس کے متعلق ہمارے ذہنوں میں جس قدر دشواریاں پیدا کی گئی ہیں وہ سب "ہمارے برہمنوں" کی پیدا کردہ ہیں جنھوں نے محض اپنی برہمنیت کو مستحکم رکھنے کیلئے اسے ہوّا بنا رکھا ہے۔ اور جس کیلئے (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے الفاظ میں جو انھوں نے اپنے عہد مولویت سے پہلے کہے تھے) "کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے"۔ اور جس کی تعلیم کیلئے (مودودی صاحب کے الفاظ میں) "تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کی بھی ضرورت نہیں"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کبار کی اس جماعت کے ساتھ جنھوں نے وہ اٹھارہ علوم کسی دارالعلوم میں نہیں پڑھے تھے جن کا پڑھنا آج قرآن فہمی کیلئے ضروری قرار دیا جاتا ہے، اسلامی نظام مملکت تشکل فرمایا اور اسی سنت رسولؐ اللہ کے مطابق قرآن کی تعلیم کی روشنی میں اسلامی نظام قائم کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہ ہے قرآن کے مطابق وضع آئین کا پہلا بنیادی اصول۔

وحدتِ آئین کے بعد وحدتِ ملت اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی ستون ہے جس نظام میں ملت کے ایک فرد اور دوسرے فرد میں کوئی بھی تفریق کی جاتی ہے وہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس تفریق میں سب سے زیادہ خطرناک مذہبی فرقہ بندی ہے جسے قائم رکھنے کے لئے ہمارے علمائے کرام سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ اس تفریق کے بعد وطنی، جغرافیائی، نسلی، لسانی اور صوبائی تفریق آتی ہے جس کی ایک اسلامی نظام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ جس نظام میں مذہبی یا غیر مذہبی بنیادوں میں سے کسی بنیاد پر بھی افراد ملت میں تفریق روا رکھی جاتی ہے وہ اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلامی نظام میں پوری کی پوری ملت ایک پارٹی ہوتی ہے ملت کے اندر کسی الگ پارٹی کا وجود اسلامی نظام کی رو سے جائز نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں دو ہی جماعتیں ہیں۔ امت مسلمہ اور غیر مسلم۔

اسلامی نظام کا تیسرا بنیادی رکن خدا کی صفت رب العٰلمینی کا مظاہرہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد مملکت (بلا تفریق

مذہب وملت) کی بنیادی ضروریات زندگی کا کفیل بھی نظام مملکت ہوگا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پاکر تکمیل تک پہنچانے کے اسباب وذرائع فراہم کرنے کا بھی۔ جس نظام میں کوئی فرد مملکت بھی ان چیزوں سے محروم رہ جائے وہ نظام اسلامی نہیں قرار پا سکتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی نظام اس قسم کی ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے جبکہ رزق کے سرچشمے خود نظام کی تحویل میں ہوں۔ اگر وسائلِ پیداوار افراد کی ملکیت میں رہیں تو نظام مملکت کے لئے ربوبیتِ عامہ کی بنیادی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے "ارض" کے لئے کہدیا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذریعہ ہے اسلئے اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔

اسلامی نظام کے لئے چوتھا بنیادی رکن یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں اس قسم کا معاشرہ تشکل کرنے کے بعد اس امر کی کوشش کرے کہ یہی نظام پھیلتے پھیلتے تمام دنیا کو محیط ہو جائے اور اس طرح امت مسلمہ کو وہ بین الاقوامی (وسطیٰ) حیثیت مل جائے جس کے لئے اسے اللہ نے مبعوث کیا ہے۔ اس کیلئے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا جائیگا اور اس کے بعد اس مشن کو آگے پھیلایا جائے گا۔

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق اسلامی نظام کا آئین مرتب ہوتا ہے اگر اربابِ حل وعقد یا قوم سمجھتی ہے کہ ہمیں اپنا نظام قرآن کے انہی اصولوں کے مطابق مرتب کرنا چاہیئے تو اس کے لئے اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ محض سفارشات ہیں جن میں ترمیم وتنسیخ بھی کی جا سکتی ہے اور مسترد بھی حتیٰ کہ ان سفارشات کو قبول کر لینے کے بعد بھی کانسٹی ٹیوشن کو بدلنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے اسلئے جو لوگ سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ ہمارا آئین قرآنی خطوط پر تشکل ہونا چاہیئے انھیں اس بات سے نہیں گھبرانا چاہیئے کہ اب تو اس کمیٹی نے اپنی سفارشات بھی مرتب کر لی ہیں۔ اگر وہ ملک کے سنجیدہ طبقہ میں اس قسم کی ذہنی تبدیلی پیدا کر دیں تو پاکستان کے آئین کی یہ تبدیلی ہر وقت ممکن ہے۔ اس کیلئے نہ کسی سے ٹکرانے کی ضرورت ہے نہ متصادم ہونے کی۔ ضرورت ہے اس قرآنی نظریہ کو عام کرنے کی۔ اس ضمن میں طلوع اسلام اپنی بساط کے مطابق جو کچھ کر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ اس کی کوششوں سے متفق ہیں تو اس کے پیش کردہ فکر کو آگے بڑھانے میں اس کا ہاتھ بٹائیے آپ کا اس سے تعلق محض ایک رسالہ اور خریدار کا تعلق نہیں۔ یہ ایک تحریک کا نقیب ہے اور آپ اس تحریک کے کل پرزے ہیں۔ اپنے اس تعلق کو زیادہ استوار کیجئے اور طلوع اسلام کو قرآنی فکر کا مرکز بنا کر آپ اس کی مختلف شاخیں بن جائیے۔ اگر آپ اس کیلئے تیار ہیں تو ہمیں اس سے مطلع کیجئے۔ تاکہ اس کے مطابق ایک متعین پروگرام آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔

"واللہ المستعان"

نہایت ضروری اعلان

یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے ادارۂ طلوع اسلام کا دفتر رابسن روڈ سے، بندر روڈ (چوک سول ہسپتال) پر منتقل کر دیا گیا ہے
اس لئے آئندہ تمام مراسلات میں اس تبدیلیٔ پتہ کا خیال رکھئے

یاد رکھئے

آئندہ سے طلوعِ اسلام کا پتہ یہ ہے

دفتر ادارۂ طلوع اسلام بندر روڈ۔ چوک سول ہسپتال کراچی

دستور پاکستان

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ

دستور پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی کہ وہ ان بنیادی اصولوں Basic Principles کے متعلق سفارشات مرتب کرے جن پر دستور پاکستان کی عمارت تعمیر کی جائے۔ اس کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ ۱۹۵۰ء میں شائع کی لیکن ملک کی طرف سے اس کی ایسی مخالفت ہوئی کہ حکومت کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ ان سفارشات کو قابل اعتنا نہ سمجھے اور ملک کے ارباب حل وعقد سے درخواست کرے کہ وہ بنیادی اصولوں کے متعلق اپنی تجاویز حکومت کے پاس بھیجیں۔ طلوع اسلام پہلے دن سے یہ دعوت دیتا چلا آرہا تھا کہ پاکستان کا قانون قرآن کے اصولوں کے مطابق مرتب ہونا چاہئے اس دعوت کے پیش نظر طلوع اسلام کی طرف سے ایک مسودہ "قرارداد مقاصد" اور دوسرا مسودہ "بنیادی اصول" مع "بنیادی حقوق" ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء سے پہلے مجلس دستور ساز کے پاس بھیجدیا گیا۔ طلوع اسلام کو کچھ معلوم نہیں کہ ان مسودات کا کیا حشر ہوا۔ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے جن دوسرے لوگوں کی طرف سے اس قسم کے مسودات گئے تھے حکومت نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا کہ ان تجاویز کا انجام کیا ہوا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا رہا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اپنی سفارشات پر دوبارہ غور کر رہی ہے۔ چنانچہ اب محترم وزیر اعظم پاکستان نے ان کی دوسری رپورٹ پارلیمان کے سامنے پیش کر دی ہے۔ یہی رپورٹ اس وقت زیر تبصرہ ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر طلوع اسلام میں تفصیلی تنقید شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ قرارداد مقاصد پر بھی تنقید شائع ہوئی تھی۔ (اس کے لئے نومبر ۱۹۵۰ء کا طلوع اسلام دیکھئے) طلوع اسلام کی طرف سے جو مسودات بھیجے گئے تھے وہ فروری ۱۹۵۱ء کے پرچہ میں شائع کر دیئے گئے تھے۔ زیر نظر تنقید کے مطالعہ کے وقت ان پرچوں کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ جو کچھ ان میں شائع کیا گیا تھا اسے دہرایا نہیں جائے گا بلکہ اُن کی طرف محض اشارہ کر دیا جائے گا۔

طلوع اسلام میں اس وقت تک جو کچھ دستور پاکستان سے متعلق لکھا گیا ہے اسے ہم نے قارئین کی سہولت کی خاطر دو چھوٹی چھوٹی کتابوں میں شائع کر دیا ہے ایک کا نام ہے "اسلامی نظام" اور دوسری کا عنوان ہے۔ "قرآنی دستور پاکستان" ان کتابوں کے مطالعہ سے دستور پاکستان کا پورا پس منظر آپ کے سامنے آجائے گا۔

ایک بنیادی سقم زیر نظر رپورٹ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا کہ پاکستان بدستور ڈومینین Dominion کی حیثیت رکھے گا اور دولت مشترکہ Common-Wealth کا ممبر رہے گا یا اب ان غیر نظری بندھنوں سے اسے نجات مل جائے گی۔ اس وقت تک تو یہ کیفیت ہے کہ اگرچہ انگریز کے سانپ کو یہاں سے نکلے پانچ چھ سال کا عرصہ ہونے کو آیا، اس کی لکیریں نہ صرف ہمارے در و دیوار پر بلکہ ہمارے قلب و دماغ میں بدستور موجود ہیں اور یہ لکیریں اپنی ہلاکت انگیز سمیت کے اعتبار سے اصلی سانپ سے کسی صورت میں کم نہیں۔ کسی غیر قوم سے معاہدات کی رو سے موافقت کے تعلقات اور شئے ہے اور اس کا حاشیہ بردار بن کر رہنا اور شئے۔ اگر وقت کے مصالح دولت مشترکہ کی ہم مجلسی کے مقتضی ہیں تو اس کی صورت برابر کے معاہدہ کی شکل میں بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بہرحال اس کمیٹی کو چاہیئے تھا کہ کم از کم اصول ہدایت Directive Principles میں ہی اس کا ذکر کر دیتی تاکہ پاکستان کے مستقبل کا رُخ تو متعین ہو جاتا۔

قرارداد مقاصد کمیٹی کی بنیادی سفارش یہ ہے کہ مملکت اپنے تمام مسالک اور اعمال میں قرارداد مقاصد کو اپنا راہنما بنائیگی ہم (نومبر ۱۹۵۲ء کے پرچہ میں) تفصیلاً بتا چکے ہیں کہ قرارداد مقاصد کے اکثر و بیشتر اجزاء قرآن کریم کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسی قرارداد مقاصد کو مملکت کے منہاج و مسلک کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس قرارداد کو مجلس مقننہ Constituent Assembly منظور کر چکی ہے اس لئے اس بارہ میں اب کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ لیکن جس مجلس مقننہ نے اسے منظور کیا تھا وہی اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے اس قرارداد کو قرآنی خطوط پر لے آنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ ؎

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

اصول ہدایت کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے شروع میں چند سفارشات بطور اصول ہدایت درج کی ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کسی ضابطۂ آئین میں اصول ہدایت کی پوزیشن کیا ہوتی ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اصول ہدایت آئین یا قانون کی حیثیت اختیار نہیں کرتا اس لئے ان کی حیثیت اخلاقی مواعظ Sermon سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ سچ پوچھئے تو اس قسم کی باتیں ایک پولیٹکل پارٹی اپنے منشور Manifesto میں شائع کیا کرتی ہے تاکہ اس سے پروپیگنڈے کا کام لیا جا سکے۔ زیر نظر رپورٹ کے اصول ہدایت بھی کچھ اسی قسم کے مقاصد کے آئینہ دار نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان میں وہ تمام باتیں درج کر دی گئی ہیں جن کا مطالبہ ایک Welfare State سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آئین سے متعلق سفارشات میں ان کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ بہرحال ان اصول ہدایت میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں خوش آئند کہا جا سکتا ہے اور کئی ایک ایسی بھی ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے۔ مثلاً

(۱) ایک شق میں یہ لکھا ہے کہ مملکت کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ پاکستان کے ان باشندوں کی بنیادی ضروریات زندگی (خوراک لباس۔ مکان۔ تعلیم۔ اور طبی امداد) بہم پہنچانے کا انتظام کرے جو عارضی یا مستقل طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہ رہیں۔ خواہ

یہ چیز بے روزگاری کی وجہ سے ہو یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے ہو۔

طلوع اسلام روز اوّل سے اپنی اس پکار کو برابر دہرائے جا رہا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی کے بہم پہونچانے ہی کی ذمہ دار ہو بلکہ وہ تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کے کامل نشوونما پانے کے مواقع یکساں طور پر بہم پہنچائے۔ زیر نظر رپورٹ میں اس ذمہ داری کو صرف طبعی ضروریات تک ہی محدود رکھا گیا ہے اور اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں اتنا ہی کچھ لکھا ہے۔ اگر یہ کمیٹی اس چارٹر کے بجائے قرآن سے راہنمائی لیتی تو وہ اس ذمہ داری کو اور بھی وسیع کر دیتی۔ قرآن کا بنیادی مقصد نوع انسانی کی ربوبیت ہے اور ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج نقطۂ تکمیل تک پہنچانا۔ جسمانی پرورش نظام ربوبیت کا ایک گوشہ ہے۔ بہرحال اس میں بھی غنیمت ہے۔

(۲) ایک شق میں تحریر ہے کہ ایسی کوشش کی جائے کہ دولت اور وسائل پیداوار چند افراد کے ہاتھوں میں مقید ہو کر نہ رہ جائیں۔

یہ تجویز بھی مستحسن ضرور ہے لیکن قرآن اس سے بڑھ کر کچھ اور چاہتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، قرآن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تمام افراد انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مملکت اس اہم اور ہمہ گیر ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی جب تک وسائل پیداوار خود مملکت کی تحویل میں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسائل پیداوار پر (جس کے لئے اس نے الارض کی اصطلاح استعمال کی ہے) انفرادی ملکیت کو جائز قرار نہیں دیتا۔ جب وہ افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر عائد کرتا ہے تو وہ رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیت میں کس طرح رہنے دے سکتا ہے؟ لہٰذا اگر مملکت پاکستان کو مملکت کے نادار بیروزگار بیمار اور لاچار طبقہ کی ضروریات زندگی کو بہم پہونچانا ہے (جیسا کہ خود اس کمیٹی نے تجویز کیا ہے) تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنی تحویل میں رکھے تاکہ پیداوار کی تقسیم افراد کی ضروریات کے اعتبار سے کی جا سکے۔ اگر اس نے ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری کو تو اپنے سر لے لیا۔ لیکن وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے دیئے تو وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں سخت ناکام رہے گی اور مفسدین کو موقع مل جائے گا کہ وہ عوام کو حکومت کے خلاف مشتعل کر دیں۔ چنانچہ ماڈرن مُلّا کے طبقہ نے ابھی سے اس کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ اس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ نظام شریعت کی رو سے عوام کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری حکومت کے سر عائد ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ فتویٰ بھی دے رکھا ہے کہ زمین، جائیداد دولت وغیرہ کی انفرادی ملکیت پر کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی: "انفرادی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے۔" ("مسئلہ ملکیت زمین" از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۵۲) ظاہر ہے کہ جب ایک طرف حکومت سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔ اور دوسری طرف یہ کہدیا جائے کہ وہ وسائل پیداوار کی ملکیت میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کر سکتی کیونکہ ایسا کرنا خلاف شریعت ہے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس حکومت کو ناکام بنا کر بدنام کیا جائے۔ زیر نظر رپورٹ میں بھی اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہیں نکل سکتا۔

فرقہ داری (۳) ایک شق میں یہ کہا گیا ہے کہ مملکت اس کی کوشش کرے کہ پاکستان سے قبائلی، نسلی اور اسی قسم کے

دوسرے غیر اسلامی امتیازات کو دور کرے، اس وقت سب سے بڑے جذبات منافرت جو پاکستان کی ملت کو بری طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں صوبجاتی امتیازات اور مذہبی فرقہ بندی کی بنا پر قائم ہیں۔ زیر نظر رپورٹ میں ان دونوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ جہاں تک مذہبی فرقہ داری کا تعلق ہے۔ یہ حضرات معذور ہیں اس لئے کہ مختلف فرقوں کے مولوی صاحبان نے یہ چیز ان کے دل میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دی ہے کہ مسلمانوں سے موجودہ مذہبی فرقوں کا دور کرنا یکسر ناممکن ہے ایسا کرنے کا نام مداخلت فی الدین ہوگا جسے کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میں دنیا سے ہر قسم کے اختلافات (جن میں مذہبی فرقہ داری سب سے پہلے آجاتی ہے) مٹانے کے لئے آیا ہوں۔ اگر مولوی صاحبان کا نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ قوت تو ہے کہ وہ اور تفرقوں کو مٹا دے لیکن اس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کے باہمی فرقوں کا اختلاف مٹا سکے۔ اگر قرآن کے متعلق ہمارا ایمان ایسا ہی ہے تو اس ایمان اور کفر میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا اصل یہ ہے کہ یہ فرقے مولویوں کے پیدا کردہ ہیں اور مولوی انہیں برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ خود ان کی ہستی اور مفاد اسی فرقہ داری سے وابستہ ہے۔ قرآن میں یہ قوت موجود ہے کہ وہ ان فرقوں کو مٹا دے لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی مولوی بھی مٹ جاتا ہے اس لئے مولوی کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ مسلمان قرآن کے قریب نہ آنے پائے اور طوعاً و کرہاً اسے تسلیم کرے کہ اس کی قسمت کے لکھے کی طرح فرقے بھی نہیں مٹ سکتے۔ یہ انتہائی شکست خوردگی کا مظاہرہ ہے۔

باقی رہے صوبجاتی امتیازات تو ان کی گرہیں خود اس رپورٹ میں کس دی گئی ہیں۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان ہوگا۔

ربوبیت عامہ

(۴) ایک شق میں یہ کہا گیا ہے کہ مملکت کوشش کرے کہ اقوام عالم میں امن، حفاظت اور خیر سگالی کے جذبات کی پرورش ہو۔ ایک اسلامی مملکت کا اتنا ہی فریضہ نہیں اس کا مقام اس سے بہت اونچا ہے۔ ایک طرف اسے خدا کی صفت رب العالمین کا مظہر ہونا چاہیئے یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت کی ذمہ دار۔ دوسری طرف اسے شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ہونا چاہیئے۔ یعنی تمام اقوام عالم کی نگران و محافظ۔ مملکت پاکستان کو اپنے سامنے یہ مقام کم از کم بطور نصب العین تو رکھ لینا چاہیئے۔

(۵) ایک شق میں یہ لکھا ہے کہ ملک کے موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے اور قرآن اور سنت کے اُن احکام کی تقنین کی جائے جنہیں ملک کا قانون بنایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ایک دوسری شق میں لکھا ہے کہ شراب، قمار بازی، عصمت فروشی کی ممانعت کی جائے اور جتنی جلدی ہو سکے ربا (سود) کو ممنوع قرار دیا جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ لکھ دیا گیا کہ ملک کے موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور کتاب و سنت کے دیگر احکام کو قانونی شکل دی جائے۔ تو اس کے بعد صرف شراب اور قمار بازی وغیرہ کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی۔ کہیں یہ غیر شعوری طور پر اس پروپیگنڈے کا اثر تو نہیں جو ملاؤں نے موجودہ لیڈروں کے خلاف کر رکھا ہے؟

(۶) ایک شق میں یہ کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کی جائے۔ جیسا کہ طلوع اسلام میں کئی بار لکھا جا چکا ہے۔ زکوٰۃ

کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں۔ قرآن کی رو سے ایک اسلامی مملکت کے تمام حاصل جو ملت کی نشوونما (زکوٰۃ) کا ذریعہ بنتے ہیں زکوٰۃ کہلاتے ہیں۔ اس لئے زکوٰۃ کی الگ تنظیم کے کچھ معنے ہی نہیں۔

اسی طرح اوقاف کی بھی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ کسی مرنے والے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ آنے والی نسلوں پر اپنی مرضی کو ابد الآباد تک مسلط کر جائے۔

(۷) ایک شق ایسی ہے جو خالص مُلّایانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک ادارہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قائم کیا جائے۔ معروف کا حکم دینا (امر بالمعروف) اور منکر سے روکنا (نہی عن المنکر) اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لئے ایک الگ ادارہ کے کیا معنی؟ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تجویز مولویوں کے اثر کا نتیجہ ہے جن کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی وعظ کہنا ہے اور یہ فریضہ صرف مولوی صاحبان سے متعلق ہے۔ اس ادارہ کے معنی یہ ہوں گے کہ وعظ گو مولوی ملازم رکھے جائیں گے اور وہ حکومت کی طرف سے وعظ کہتے پھریں گے۔ اور میلاد پڑھا کریں گے۔ اگر اراکین کمیٹی کا ذہن مولویوں کے اثرات سے مأوف نہ ہو چکا ہوتا۔ اور وہ صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لفظی معانی ہی پر غور کر لیتے تو اس قسم کے جداگانہ ادارہ کے قیام کی کبھی سفارش نہ کرتے (اور نہ ہی زکوٰۃ کی الگ تنظیم کی سفارش کرتے۔ وہ سفارش بھی خالص مولویانہ اثر کا نتیجہ نظر آتی ہے) امر کے معنی ہیں حکم کرنا اور نہی کے معنے ہیں روکنا۔ انگریزی میں اسے کہیں گے (Enforce or prohibit) یہ ظاہر ہے کہ آپ کسی چیز کا حکم یا کسی امر کی ممانعت صرف قانون کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ وعظ کے ذریعہ نہ حکم دیا جا سکتا ہے نہ کسی کو بُرے کاموں سے روکا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے حکومت کا قیام ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی حکومت کے متعلق صراحت سے مذکور ہے۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے اور افراد مملکت کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے ان کے تمام امور کے آخری فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق ہوا کریں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مولویوں کی وعظ اور نصیحت سے ممکن ہوتا تو اس کے لئے حکومت اور اقتدار کی کیا ضرورت تھی۔ مولوی کو تو انگریزوں کے زمانہ میں بھی وعظ کہنے کی اجازت تھی اور آج ہندوستان میں بھی اجازت ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مولویوں کی وعظ و نصیحت سے ... ہو سکتا تو پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر مولویوں کو یہ قوت حاصل ہے کہ وہ اپنے وعظ سے کسی کو معروف کا حکم دے سکیں اور منکر سے روک سکیں تو وہ شرعی نظام کا حکومت سے کیوں مطالبہ کرتے ہیں۔ شرعی نظام سے بالآخر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی تو مراد ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے ایک الگ ادارہ کے

قیام کی تجویز بڑی مضحکہ انگیز اور افلاس فکر و تدبر کی دلیل ہے۔

لیکن زکوٰۃ۔ اوقاف اور مساجد کی تنظیم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے وعظ کہنے والوں اور میلاد پڑھنے والوں کے ادارہ کے قیام سے بیکار مولویوں کی معاش کا انتظام تو ہو جائے گا۔ اور غالباً یہی ان سفارشات سے مقصود بھی ہے۔

زر بر سر فولاد نہی نرم شود

یہ وہی ملوکیت و ملائیت کا گٹھ جوڑ ہے جو صدیوں سے ہمیں تباہ و برباد کرتا چلا آرہا ہے اور نہ معلوم کب تک مسلمانوں کو چکی کے ان دو پاٹوں میں پسنا ہے۔

اگر مقصد یہی ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لئے کسی جداگانہ ادارہ کی کیا ضرورت ہے جبکہ ان ہی سفارشات میں یہ شق بھی موجود ہے کہ ان تمام لوگوں کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا حکومت کے ذمہ ہوگا جو مستقل یا عارضی طور پر حصول معاش کے قابل نہ رہیں۔ مولویوں کا گروہ مستقل طور پر حصول معاش سے معذور ہے اس لئے وہ اس شق کے اندر خود بخود آجاتے ہیں لیکن شاید مولوی صاحبان ناداروں اور محتاجوں کی صف میں بھی اپنی امتیازی شان کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

(۸) ایک شق میں یہ بھی لکھا ہے کہ رئیس مملکت اس شخص کو چنا جائے جو قابلیت، سیرت، دیانت اور تقویٰ کے اعتبار سے اس قابل ہو۔ لیکن اصل سفارشات میں اس کے لئے اس قسم کی کسی قابلیت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس کا اصل مقام اصل سفارشات تھیں نہ کہ اصول ہدایت۔

(۹) ایک شق میں یہ لکھا گیا ہے کہ بچوں، جوانوں اور عورتوں کو ایسے کاموں پر نہ لگایا جائے جو اُن کی عمر اور صنف کے اعتبار سے اُن کے لئے موزوں نہ ہوں۔ معلوم نہیں کہ بوڑھوں کو اس سے کیوں خارج کر دیا گیا ہے۔

(۱۰) ایک شق میں یہ لکھا گیا ہے کہ جو سرکاری ملازم ریٹائرمنٹ سے پہلے مر جائیں اور اُن کے پسماندگان کے گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو اُن کے لئے مناسب مالی امداد بہم پہنچائی جائے۔

جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں ایک اسلامی مملکت میں تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس میں یتیم اور بیوگان خود بخود آجاتے ہیں۔ اس لئے معلوم نہیں کہ سرکاری ملازمین کے یتیموں اور بیواؤں کا خصوصیت سے کیوں ذکر کیا گیا۔ یاد رکھئے جس مملکت میں کوئی ایک فرد (بلکہ قرآن کے الفاظ میں کوئی چلنے والا) رات کو بھوکا سو جائے تو اس مملکت کو حق حاصل نہیں کہ وہ اسلامی مملکت کہلا سکے۔

(۱۱) ایک شق میں کہا گیا ہے کہ حصول عدل مفت ہونا چاہیئے۔ یہ طلوع اسلام کی تجویز تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ کمیٹی نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے۔

مجلس علماء

اب اصل رپورٹ کی طرف آیئے۔ اصل رپورٹ میں ایک پورا باب اس عنوان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون رائج نہ ہونے پائے جو قرآن و سنت سے متصادم ہو۔ اس کے لئے تجویز یہ ہے

کہ رئیس مملکت ایک ایسی مجلس قائم کرے گا جو اسلامی قوانین کے پانچ ماہرین پر مشتمل ہوگی۔ اگر مجلس مقننہ میں پیش شدہ کسی بل کے متعلق کوئی مسلمان ممبر یہ اعتراض کردے کہ کوئی بل یا اس کی کوئی شق قرآن وسنت کے خلاف ہے تو رئیس مملکت اس بل کو اس مجلس کے پاس بھیجے گا اور اگر وہ اس کی تائید کردیں کہ وہ بل یا اس کی کوئی شق واقعی قرآن وسنت کے خلاف ہے تو اس بل کو مقننہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ کہ وہ اس پر دوبارہ غور کرے اسی قسم کی مجالس صوبوں میں بھی ہوں گی۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے کہ دستور کی کسی شق میں مولویوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ۔۔ کہ وہ منتخب ہوکر مقننہ کے ممبر نہ بن سکتے ہوں۔ لہذا مولویوں کے لئے کھلی ہوئی راہ یہ ہے کہ وہ منتخب شدہ ممبروں کی حیثیت سے مقننہ میں آئیں اور ایوان کو بتائیں کہ فلاں بل یا اس کی فلاں شق کس طرح قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ لیکن اگر عوام کو مولویوں پر اعتماد نہیں اور مولویوں کو خطرہ ہے کہ وہ منتخب ہوکر مجالس مقننہ میں نہیں آسکیں گے تو پھر حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ اس قسم کی جماعت کو اس قسم کی پوزیشن دیدے؟ نیز اسے بھی سوچئے کہ کیا آپ کے دونوں ایوانوں کے پانچ سو بیس ممبروں میں پانچ مسلمان بھی ایسے نہیں ہوں گے جو بتا سکیں کہ فلاں بات کتاب وسنت کے خلاف ہے!

آپ ہماری کتاب "قرآنی دستور پاکستان" میں دیکھیں گے کہ ہم کتاب کے ساتھ سنت کی پوزیشن کے متعلق کتنا کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور کتنی مرتبہ یہ بتا چکے ہیں کہ کسی اسلامی مجلس مقننہ میں علماء کی جداگانہ مجلس کا وجود کس طرح دین اور سیاست کی اس ثنویت کے مرادف ہے جسے قرآن مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن جسے بعد میں مسلمانوں نے عیسائیوں کی پاپائیت اور ہندوؤں کی برہمنیت اور ایران کی مجوسیت سے مستعار لے کر اپنے ہاں داخل کرلیا وہ کونسا مسلمان ہے جسکے دل میں نبی اکرمؐ کی عزت وعظمت نہ ہو جو حضورؐ کی عظمت تو مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ لیکن جس مقصد کے لئے مولوی صاحبان کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور لاتے ہیں۔ وہ اتباع سنت کی آڑ میں خود اپنی آمریت کا تسلط ہے۔ اس حقیقت کو ہم پہلے بھی کئی بار بے نقاب کرچکے ہیں۔ اس وقت صرف اس کے نمایاں خطوط کو دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔

جب جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی پارٹی کا خاکہ پیش کیا تھا تو اس ضمن میں لکھا تھا کہ

> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کرکے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہوجائے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۱ء بحوالہ "جماعت اسلامی پر ایک نظر")

اس پارٹی کی حکومت کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ "یہ اسٹیٹ فاشسٹی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھے گی" (اسلام کا نظریۂ سیاسی) ان عزائم اور مقاصد کو لے کر یہ جماعت وجود میں آئی۔ اب اس کے بعد کتاب وسنت کی اس پر کا جائزہ لیجئے جس کی آڑ میں مودودی صاحب اپنا آمرانہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مسلک کا تجزیہ حسب ذیل ہے۔

(۱) شرعی نظام کتاب وسنت پر مبنی ہوگا

(۲) کتاب اللہ صرف مجمل احکام دیتی ہے جن کی تفصیل سنت رسولؐ کے اندر ملتی ہے۔ لہٰذا شرعی نظام کے تفصیلی احکام کتب احادیث میں مل سکتے ہیں۔

(۳) کتب احادیث میں صحیح اور غلط، مستند اور ضعیف ہر قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ ان میں سے صحیح روایات ہی شرعی نظام کے احکام بن سکتی ہیں۔

(۴) یہ بات صرف ایک مزاج شناس رسولؐ ہی بتا سکتا ہے کہ کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی غلط۔ نیز اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو یہی مزاج شناس رسولؐ بتا سکتا ہے کہ اگر رسولؐ اللہ اس وقت موجود ہوتے تو اس معاملہ میں آپ کا فیصلہ کیا ہوتا۔[1]

اس تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کتاب وسنت سے مراد درحقیقت مزاج شناس رسولؐ اللہ کے اپنے فیصلے ہوں گے جنہیں وہ سنت رسولؐ اللہ کا لیبل لگا کر نافذ کرے گا تاکہ ان پر تنقید کرنے والا ذات رسالت مآبؐ کی توہین اور اُن سے انکار کرنے والا معصیت رسولؐ کے جرم کا مرتکب گردان کر مستحق عقوبت قرار دیدیا جائے اور اسی طرح کسی کو جرأت نہ ہو کہ ان فیصلوں کے خلاف لب کشائی کر سکے۔

یہ ہے وہ ٹکنیک جس کی رو سے مودودی صاحب اقتدار حاصل کر کے خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنی آمریت کا سکہ چلانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی بدبختی ہے کہ اس کے ارباب حل وعقد جن میں زیر نظر رپورٹ کے مرتب کنندگان بھی شامل ہیں، اس جماعت کے پروپیگنڈے سے خائف نظر آ رہے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے علماء کی مجلس کی تجویز رپورٹ میں شامل کر دی ہے۔ کہدیا جائے گا کہ ان مجالس علماء کی حیثیت محض مشاورتی ہے۔ لیکن جب آپ ایک مرتبہ اس بدو کے اونٹ کو خیمہ کے اندر اپنی گردن داخل کر لینے کی اجازت دیدیں گے تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اونٹ خیمہ کے اندر ہوگا اور عرب خیمہ کے باہر۔ یا آپ کو اُن سے اُس قسم کی مفاہمت کرنی پڑے گی جیسی ہمارے دور ملوکیت میں ہر بادشاہ کو مذہبی پیشواؤں کے ساتھ کرنی پڑتی تھی۔ جب آپ کسی بل کا مسودہ ان علماء کے پاس بھیجیں گے اور وہ اس کے متعلق لکھدیں گے کہ وہ شریعت کے خلاف ہے تو اس کے بعد یا تو آپ کو اُن کی بات ماننی پڑے گی (خواہ وہ ..... عقل وفکر سے دور اور خود اسلام کے بھی خلاف کیوں نہ ہو) اور یا آپ اسے مسترد کر کے اپنا اصلی مسودہ پاس کر لیں گے۔ اس دوسری شکل میں ان حضرات کی ذریت سارے ملک میں شور مچا دے گی کہ مجلس مقننہ کی یہ حرکت خدا اور رسولؐ کے خلاف الٹی میٹم ہے اور اس کے بعد وہ نہ جانے بھولے بھالے عوام سے کیا کچھ نہ کرا دیں۔ عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے یہ حضرات ابھی سے عجیب وغریب انداز سے گڑبڑ مچا رہے ہیں۔

---

[1] مندرجہ بالا دعاوی کے ثبوت میں مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات اور حوالے طلوع اسلام میں متعدد بار پیش کئے جا چکے ہیں۔

مثلاً مودودی صاحب ایک زمانہ میں فقہ حنفی کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ

میں اس امر کا سخت مخالف ہوں کہ علمائے کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں اور اس امر کو بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانہ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں.... قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سد راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانہ کا مسلمان قرآن و حدیث کو پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلے گا. جس طرح ترک اور ایران چل نکلے۔

(ترجمان القرآن - اگست ۱۹۳۶ء)

ترکوں کے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ جواب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، اُن کی رجعت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا.... وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں۔ (تنقیحات صفحہ)

یہ تو اس زمانہ کی بات تھی مگر اب مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ چونکہ پاکستان میں حنفیوں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں وہی حنفی قانون نافذ کرنا چاہیئے جو ہدایہ اور بدائع، عالمگیری، اور تاتارخانیہ، شامی اور کنز الدقائق میں لکھا ہوا ہے۔ وہی مودودی صاحب جو کبھی کہا کرتے تھے کہ "میں نہ گروہ علماء کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ ہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو" (ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۵ھ) اور جن کا فیصلہ یہ تھا کہ

"پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں" (تنقیحات صفحہ)

اب بڑھ بڑھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ شرعی نظام کے بارہ میں ان اکتیس علماء کا مطالبہ کیوں نہیں مانا جا رہا جو ۱۹۵۱ء میں کراچی میں جمع ہوئے تھے۔

آپ غور فرمایئے کہ جن لوگوں کے سیاسی حربوں کا یہ حال ہو اگر ان کے کسی مشورہ کو مجلس مقننہ نے نہ مانا تو وہ کن کن حرکتوں پر نہ اتر آئیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شرعی نظام سے مقصد یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضہ کے مطابق اپنے لئے جزئی قوانین خود مرتب کریں اس کے لئے علماء کی کسی جماعت کی ضرورت نہیں۔ قرآن سہل عربی زبان کی کتاب ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر اور اپنے زمانہ کے تقاضوں پر نگاہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے

علم کے پرانے ذخیروں کی ضرورت لاینفک نہیں انکی حیثیت شادرتی ہو۔ چنانچہ اس باب میں خود مودودی صاحب نے فرمایا تھا۔

قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں سے نہیں ...... قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے۔ (تنقیحات صفحہ ۱۳۳-۲۲۲)

جہاں تک عقل اور فکر کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ترجمان القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں

امامت خواہ وہ آگ کی طرف لیجانے والی ہو یا جنت کی طرف بہر حال اس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و فواد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کریں۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا ئی ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ (بحوالہ "اسلامی جماعت پر ایک نظر")

لہٰذا جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کو سامنے رکھ کر اپنے سمع و بصر و فواد سے کام لیں اور اس طرح پاکستان کو اس تباہی سے بچالیں جس کی طرف اسے علماء کرام کا یہ گروہ خدا اور رسولؐ کے نام کی سپر میں کشاں کشاں لئے جانے کی فکر میں ہے۔

مملکت کا نام

مملکت کے نام میں اسلام کا لفظ پھر کہیں نہیں آیا۔ معلوم نہیں یہ حضرات اسلام کے نام ہیں۔

وفاقی نظام

رپورٹ میں پھر اسی کی سفارش کی گئی ہے کہ مملکت کا نظام وفاقی ہوگا۔ یعنی اس کے مختلف صوبے اپنے اپنے مراکز الگ رکھیں گے اور مشترکہ مرکز صرف ان مقاصد کے لئے ہوگا جو دستور کی رو سے طے کرلئے جائیں گے۔

ہم (فروری ۱۹۵۱ء کے طلوع اسلام میں) بہ صراحت لکھ چکے ہیں کہ اس قسم کا نظام حکومت پاکستان کی تباہی کا موجب بنے گا۔ پاکستان کی آج بھی یہ حالت ہے کہ مختلف صوبوں میں بالعموم اور مشرقی اور مغربی پاکستان میں بالخصوص جذبات مغائرت ہی نہیں بلکہ منافرت تک کے جذبات اُبھر آئے ہیں۔ یہ حقیقت بڑی دل خراش ہے لیکن جب یہ موجود ہے تو اس کا ذکر کرنا ہی ہوگا وفاقی نظام حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اس خلیج کو اور وسیع اور گہرا کر دیا جائے جو اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں ایک جگہ کے مسلمان کو دوسری جگہ کے مسلمان سے الگ کئے ہوئے ہے۔ ہمارے نزدیک وفاقی نظام ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ ہم نے اپنے پیش کردہ مسودہ قانون میں تجویز کیا تھا کہ مملکت پاکستان کا نظم و نسق وحدانی طریق سے ہونا چاہیئے۔ انتظامی سہولت کی غرض سے مملکت کو مختلف خطوں میں تقسیم کرلیا جائے لیکن ان خطوں کی الگ الگ مجالس مقننہ نہ ہوں صرف مرکز سے نافذ شدہ قوانین ان خطوں میں نفاذ پذیر ہو جائیں۔ (دیکھئے باب نہم مسودہ قانون مشمولہ قرآنی دستور پاکستان شائع کردہ طلوع اسلام)

امیر مملکت غنیمت ہے کہ اس کمیٹی نے ہماری اس تجویز کو تسلیم کر لیا ہے کہ امیر مملکت مسلمان ہوگا۔ امیر کے انتخاب کو بھی مجلس مقننہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اگرچہ اس باب میں ہماری تجویز اس سے مختلف تھی۔ امیر مملکت کے لئے صرف یہ شرائط رکھی گئی ہیں کہ وہ

(۱) پاکستان کا باشندہ ہو۔

(۲) اس کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہو۔ اور

(۳) کسی زبان میں نوشت و خواند جانتا ہو۔

ہمارے نزدیک یہ شرائط مجلس مقننہ کی عام رکنیت کے لئے بھی کافی نہیں چہ جائیکہ صدر جمہوریہ کے لئے اتنی سی صلاحیت کافی سمجھ لی جائے۔ کمیٹی کے اصول ہدایت میں (نیز صدر کے حلف نامہ میں) یہ چیز موجود ہے کہ اس میں قابلیت۔ کیریکٹر۔ دیانت اور تقویٰ ہونا ضروری ہے اور اس امر کی صلاحیت بھی کہ وہ نظام مملکت کو کتاب و سنت کے مطابق چلا سکے۔ لیکن ان شرائط کا صحیح مقام دستور کے اندر تھا۔ نہ کہ اصول ہدایت میں۔

حلف نامہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ حلف نامہ کی رسم غیر مسلموں سے مستعار لی ہوئی ہے۔ مسلمان کے لئے حلف کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے محض اقرار اور اعلان کافی ہے۔

اختیارات عفو ایک شق میں یہ لکھا ہے کہ ان امور کے علاوہ جن میں قرآن اور سنت کی رو سے عفو کی اجازت نہیں رئیس مملکت کو عفو خطا (Clemency) کے اختیارات حاصل ہوں گے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کے لئے قرآن کی رو سے عفو کی قطعاً اجازت نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ جھگڑا مولوی صاحبان کے اثر کا نتیجہ ہے کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ "حدود" میں معافی نہیں ہو سکتی۔ انہیں کون سمجھائے کہ اسلامی ضابطہ قوانین کی رو سے ہر جرم "حدود" میں آجاتا ہے۔ یعنی ایک اسلامی مملکت جن امور کو جرم قرار دیدے انہیں حدود کہا جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اب حکومت غالباً مولوی صاحبان سے ایک فہرست مرتب کرائے گی کہ کون سے جرائم میں معافی ہو سکتی ہے اور کون سے جرائم میں نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھئے ہمارا کوئی فیصلہ نہ قرآن کے مطابق ہو سکے گا نہ عقل کے مطابق جب تک مولوی کا بھوت ہمارے سروں سے نہیں اترے گا۔

صدر کی نجی حیثیت کمیٹی نے ہماری اس تجویز کو تسلیم کر لیا ہے کہ نجی حیثیت سے امیر مملکت بھی دیگر افراد مملکت کی طرح نظام عدالت کا پابند ہوگا۔

مرکزی مقننہ سفارش یہ ہے کہ مقننہ کے دو ایوان ہوں گے۔ ایک ایوان وحدتوں (Units) کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا اور دوسرا جمہور کے نمائندوں پر۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ House of Units) کی کیا ضرورت ہے۔ اس ایوان کے اختیارات ایسے نہیں کہ وہ ایوان جمہور کے فیصلوں کو مسترد کر سکے۔

دونوں ایوانوں کے اختلاف کی صورت میں ان ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ چونکہ مشترکہ اجلاس میں اکثریت ایوانِ جمہور کی ہوگی۔ کیونکہ ایوان جمہور کے چار سو ممبر ہوں گے اور صوبجاتی ایوانوں کے ایک سو بیس) اس لئے ہر حالت میں ایوان جمہور کا ہی فیصلہ برقرار رہے گا۔

ذرا غور کیجئے کہ مملکت کی آئینی مشینری کتنی بھاری ہوگی۔ ہر صوبہ میں الگ الگ پارلیمان۔ الگ الگ وزارتیں پھر مرکز میں پانچ سو بیس ارکان پر مشتمل دو ایوان اور ان کے اوپر کابینہ۔ پھر صوبوں کے گورنر۔ اور مرکز میں امیر مملکت۔ نوزائیدہ مملکت کی نرم و نازک شاخیں ان پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن یہ چیزیں پارٹی حکومت کی لعنتوں میں سے ہیں۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پارٹی کے تمام افراد نہیں تو کم از کم ان کی اکثریت کو راضی رکھے اور انہیں راضی رکھنے کے لئے مناصب و مدارج ضروری ہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر یہ کرسیاں اتنی زیادہ تعداد میں تیار کی جاتی ہیں ورنہ نظام مملکت کے لئے اتنی لمبی چوڑی تعداد کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر "گننے" کے بجائے آدمی "تول کر" لئے جائیں تو بہت کم تعداد نہایت عمدگی سے کام چلا سکتی ہے۔

ہمارے مسودہ آئین میں صوبجاتی مجالس مقننہ کا کوئی وجود نہ تھا اور مرکزی مجلس کے ارکان کی تعداد صرف دو سو تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے لئے یہی نظام بہتر ہے۔

علاقائی تفریق دونوں ایوانوں کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ ان میں آدھے ممبر مشرقی پاکستان سے اور آدھے مغربی پاکستان سے لئے جائیں اور پھر مغربی پاکستان کے ممبران کو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کی تاکید کی گئی ہے کہ مشرق اور مغرب کی اس تنصیف کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اس ناخوشگوار حقیقت کو بار بار دہراتے ہیں کہ اس قسم کی صوبجاتی تفریق ہمیں تباہ کر کے چھوڑے گی۔ بجائے اس کے کہ ہم قوم کے دل میں یہ خیال پیدا کریں کہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کہ قانون خداوندی کے نزدیک مشرق و مغرب کا امتیاز جاہلیت کی دلیل ہے، ہم الٹے اُن کے دل میں یہ خیال راسخ کئے جا رہے ہیں کہ

"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب
اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"

شرائط رکنیت جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شرائط رکنیت کے لئے صرف اتنا ہی کافی سمجھا گیا ہے کہ امیدوار کسی زبان میں لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ یہ شرط صاف صاف اس جذبہ کی غمازی کر رہی ہے کہ یہ پارٹی برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے جن میں اکثریت ان پڑھ دولتمند لوگوں کی ہے ـــــ بڑے بڑے زمیندار، جاگیردار، کارخانہ دار، سرمایہ دار ..... ہاتھوں پر سدھائے ہوئے باز، پیچھے پیچھے کتوں کا کارواں۔ دائیں بائیں مصاحبوں کا طائفہ۔ یعنی وہ نقشہ جو دنیا کے مہذب ممالک میں آج سے کہیں دو تین سو سال پہلے اور ہمارے ہاں انگریز کی غلامی میں رائج تھا۔ بدستور برقرار رکھا جائے

ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم ایک قانون ساز اسمبلی کو مرتب کر رہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی میٹنگ نہیں بلا رہے۔

یہ دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ فاتر العقل کو رکنیت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ورنہ ہماری حکومت نے تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں سے وہ شق بھی نکال دی تھی جس کی رو سے مفقود الحواس حکومت کا اہل نہیں رہتا۔

عورتوں کی رکنیت

اگرچہ مجالس مقننہ میں عورتوں کے لئے کوئی خاص نشستیں مختص نہیں کی گئیں۔ لیکن غنیمت ہے کہ انہیں رکنیت سے خارج بھی نہیں کیا گیا۔ ورنہ ہمارے مولویوں کے نزدیک معاشرہ میں عورت کی حیثیت ایک لونڈی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور لونڈی بھی ایسی جسے ہر وقت جوتے کے نیچے رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کا قول ہے کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے یہ سیدھی رہ ہی نہیں سکتی۔ ان کے وعظوں میں سنئے کہ کس طرح بر سر منبر جھوم جھوم کر پڑھا کرتے ہیں کہ ؎

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن | کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
اگر نیک بودے سر احوالِ زن | زناں را مزن نام بودے نہ زن
مشو ایمن از زن کہ زن پارساست | کہ خرلستہ بہ گرچہ دزد آشناست

بہرحال غنیمت ہے کہ عورتوں کو حق رکنیت سے محروم نہیں رکھا گیا۔ لیکن ہم اپنے معاشرہ کی موجودہ ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے اتنی ترمیم ضرور چاہتے ہیں کہ عورتوں کے لئے کم از کم چالیس سال کی شرط ہونی چاہیئے اور یہ بھی کہ وہ شادی شدہ اور اچھی خاصی تعلیم یافتہ ہوں اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی قالب میں ڈھال لینے کے قابل ہو گئے اور ہمارے قلب و نگاہ کی تربیت قرآنی منشا کے مطابق ہو گئی تو اس وقت حالات کا تقاضا کچھ اور ہوگا)

حق رائے دہندگی

رپورٹ میں حق رائے دہندگی کے لئے تعلیم کو شرط قرار نہیں دیا گیا۔ یہ چیز ہمارے سابقہ مسودہ میں بھی نظر انداز ہو گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم کی اتنی کمی ہے کہ اگر حق رائے دہندگی کے لئے تعلیم کو شرط قرار دیدیا گیا تو رائے دہندگان کی تعداد بہت کم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر تعلیم کی شرط نہ رکھی گئی تو مفاد پرست گروہ کے علاوہ دوسرے لوگ کامیاب ہو ہی نہیں سکیں گے۔ یہ خرابی بنیادی ہے اس لئے اس خرابی کے پیش نظر ہماری تجویز یہ ہے کہ

(۱) صوبجاتی یا مرکزی ایوان کی رکنیت کے لئے گریجویٹ کی شرط اور

(۲) حق رائے دہندگی کے لئے میٹرک کی شرط

ضرور رکھی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس ایک شرط سے بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو جائیں گی جن کے ہاتھوں ہم آج اس قدر نالاں ہیں۔ اس سے نہ صرف یہی ہوگا کہ معیار کامیابی بڑی حد تک دولت کی بجائے قابلیت قرار پا جائے گا۔ بلکہ ملک کی تعلیم کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہو جائے گی۔

انتخاب

ہم اپنی اس تجویز کو پھر دہراتے ہیں کہ انتخابات کے سلسلہ میں کسی امیدوار کو اپنے متعلق یا دوسرے افراد کو کسی امیدوار کے متعلق پروپیگنڈا یا حصول آراء کے لئے جدوجہد کی اجازت نہیں ہوگی۔ تمام رائے دہندگان سے حصول رائے کا مناسب انتظام حکومت کے ذمہ ہوگا۔ اور کوئی انتخاب پارٹی سسٹم کی بنا پر جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ (انتخاب کی تفاصیل کے لئے ہمارے مسودہ کا ساتواں باب ملاحظہ کیجئے جو قرآنی دستور پاکستان شائع کردہ طلوع اسلام میں شامل ہے)

صدر کے اختیارات

رپورٹ میں پھر یہی لکھا ہے کہ صدر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کے تمام فیصلوں کے نیچے صاد کر دیا کرے۔ اس کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج پھر دہراتے ہیں کہ اگر صدر کے فرائض صرف اتنے ہی ہیں تو اس تکلف کی بالآخر ضرورت کیا ہے۔ یا تو صدر کو وہ پوزیشن دینی چاہیئے جس کا وہ مستحق ہے۔ اور اگر یہ منظور نہیں تو پھر صدر کی ضرورت ہی نہیں۔ یا اگر دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات کیلئے صدر کی ضرورت ہے تو اس قسم کی کیا ضرورت ہے کہ پارلیمنٹ کے فیصلے بغرض منظوری صدر کے پاس بھیجے جائیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری فکر غلامانہ مغربی سانچوں سے نکل کر معاملات کو از خود سوچنے کی اہل ہی نہیں رہی۔

عدلیہ

کمیٹی کی سفارشات میں عدلیہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف عدلیہ کی مشینری کے متعلق ہے۔ عدل کی روح اور اصولوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ حالانکہ (جیسا کہ ہم اپنے مسودہ دستور میں لکھ چکے ہیں) ان سفارشات میں کم از کم حسب ذیل امور کی تصریح ضروری ہے؛

(۱) عدل کا حصول بلا خرچ کے ہوگا۔

(۲) مملکت کے کسی فرد کو عدالت میں باضابطہ مقدمہ چلائے بغیر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۳) قانون کی نگاہ میں ہر فرد برابر ہوگا۔

(۴) قرارداد مقاصد یا دستور اساسی کی رو سے جن بنیادی حقوق کا ذمہ مملکت نے لیا ہے ان حقوق کے پورا نہ کرنے کی صورت میں حکومت کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی۔

علاوہ ازیں عدلیہ کے متعلق سب سے بڑی اہم اور بنیادی چیز یہ تھی کہ عدلیہ Judiciary کو اجرائیہ executive سے الگ اور آزاد رکھا جائے۔ صرف اصول ہدایت میں یہ کہا گیا ہے کہ کوشش کی جائے کہ عدلیہ کو اجرائیہ سے تین سال کے اندر اندر الگ کر دیا جائے لیکن اصل رپورٹ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کو رپورٹ کی سفارشات میں شامل ہونا چاہیئے تھا کیونکہ یہ ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ چہ جائیکہ تین سال کا طویل عرصہ جس میں ...... اصول ہدایت کے ماتحت صرف کوشش کی جائے گی۔

عمال حکومت

اس عنوان کے ماتحت جو کچھ کہا گیا ہے وہ کم و بیش موجودہ قوانین و ضوابط ہی کا چربہ ہے۔ حالانکہ سروسز Services کے متعلق موجودہ قوانین ایسے ناقص ہیں کہ اُن کی رُو سے حکومت کے ملازم اور عہد جاہلیت کے غلام میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ سب سے بڑا بنیادی نقص تو یہ ہے کہ سرکاری ملازم کی کہیں داد و فریاد ہی نہیں ہوتی۔ اس کے استغاثہ

اور مرافعہ Appeal کی صورت میں فریق مقابل (یعنی خود دفتر) جج کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب مقدمات کے فیصلے یوں ہوں کہ ان میں ملزم یا مدعا علیہ خود ہی جج بن جائے تو ان فیصلوں کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔

باقی رہی Corruption سو اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ حکومت اپنے تمام ملازمین اور ان کے متعلقین کی جملہ ضروریات زندگی کی ذمہ داری لے لے۔ اور ملازمین کو ذاتی جائیداد Private Property کی قطعاً اجازت نہ ہو۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ وہی تجویز ہے جسے افلاطون Plato نے اپنی مثالی جمہوریت میں ارباب حل وعقد Guardians کے لئے اختیار کیا تھا۔ لیکن ان کے لئے شاید آج یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ دستور آج جب مثالی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اس میں عمال حکومت تو ایک طرف کسی فرد کی ذاتی جائیداد کا وجود ہی نہیں ہوتا اور تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کی کفیل مملکت ہوتی ہے۔

عمال حکومت کے ضمن میں یہ شرط بھی لاینفک قرار دینی چاہیئے کہ تمام اسامیوں کا تقرر مقابلہ کے امتحان کے نتیجہ سے ہوگا اور اس میں صوبائی تناسب یا نامزدگی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

ہنگامی اختیارات ایک شق میں کہا گیا ہے کہ رئیس مملکت کو اختیار ہوگا کہ وہ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دے اور یہ اعلان دو ماہ کے عرصہ سے آگے نہ بڑھے تاوقتیکہ اسے مقننہ کی منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے دو ماہ کا عرصہ بہت زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں مقننہ کا اجلاس ایک ہفتہ کے اندر اندر طلب کر لینا چاہیئے۔ تاکہ جو کچھ طے پائے ملکی قانون کی حیثیت سے طے پائے۔

ہم نے یہ تجویز اسی بنا پر کی ہے کہ زیر نظر رپورٹ میں قانون سازی کا آخری اختیار مقننہ کو دیا گیا ہے۔ رئیس مملکت صرف دستخط کرنے کی مشین رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس کی حیثیت یہی رکھنی ہے تو ہنگامی حالات میں بھی اس کے اختیارات کو کم از کم حد تک وسیع ہونا چاہیئے۔

متفرقات

رئیس مملکت کی معزولی ایک سفارش میں یہ لکھا ہے کہ ہر دو ایوانات کا مشترکہ اجلاس اپنی دو تہائی اکثریت سے رئیس مملکت کو معزول کر سکتا ہے لیکن رئیس مملکت کے انتخاب کے لئے دو تہائی اکثریت کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں انتخاب کے لئے بھی اتنی ہی اکثریت کی شرط ہونی چاہیئے۔

زکوٰۃ اور عشر تقسیم اختیارات کی فہرست میں زکوٰۃ کو مرکزی فہرست میں رکھا گیا ہے لیکن زمین کا لگان صوبوں کی فہرست میں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مولویوں کے مذہب کے مطابق (جو قرآن سے بالکل الگ مذہب ہے) زمین کا عشر زکوٰۃ میں شامل ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ زمین کا عشر تو مرکزی حکومت بہ مد زکوٰۃ وصول کیا کرے اور زمین کا لگان (خراج) صوبوں کی حکومتیں لیں گی۔ یعنی مسلمانوں کو اپنی زمینوں کے لئے عشر بھی دینا ہوگا، اور خراج بھی۔ یہ اسی طرح سے ہوگا جس طرح مسلمانوں کو انکم ٹیکس الگ

دینا پڑے گا اور زکوٰۃ الگ اور غیر مسلم مزے میں رہیں گے کہ انہیں نہ زکوٰۃ دینی پڑے گی نہ عُشر۔ رہا غیر مسلموں کے لئے جزیہ کا رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں نہ ہی صراحتہً خراج کا۔

آپ نے دیکھا کہ مذہب اور حکومت کی ثنویت کس قسم کی مضحکہ انگیز صورتیں پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن رپورٹ مرتب کرنے والے حضرات کو اس سے کیا دلچسپی۔ ان کے سامنے تو یہ مقصد تھا کہ رپورٹ میں کہیں کہیں مذہب کی اصطلاحات (مثلاً قرآن۔ سنت مساجد۔ اوقاف۔ زکوٰۃ وغیرہ) آجانی چاہئیں تاکہ مولوی صاحبان راضی ہو جائیں۔

بہ ہیئت مجموعی ان سفارشات کو دیکھنے کے بعد ہم اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ

دل مرا گریاں نہیں خنداں نہیں حیراں نہیں

اس لئے کہ ہمیں ان حضرات سے اس سے زیادہ کچھ اور توقع ہی نہیں تھی۔ انہوں نے کتاب اور سنت اور اسلام کے الفاظ قرار دادِ مقاصد میں شامل کر لئے حالانکہ ان میں سے شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات کو ہمارا یہ بیان مبالغہ آمیز نظر آئے لیکن یہ واقعہ ہے اگر آپ اس کا تجربہ کرنا چاہیں تو یہ بڑا آسان ہے۔ آپ ان حضرات کو کاغذ، قلم، دوات دیدیجئے اور اُن سے کہئے کہ وہ اپنے اپنے طور پر اس سوال کا جواب لکھیں کہ "اسلام کیا ہے؟" اس کے بعد آپ ان پرچوں کو دیکھئے۔ کسی ایک کا جواب دوسرے کے جواب سے نہیں ملے گا۔

دوسری طرف خیر سے ہمارے مولوی صاحبان ہیں جو دن رات اسلام۔ اسلام رٹتے رہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ نہیں تو کم از کم اُن اکتیس حضرات کو کاغذ، قلم، دوات دیدیجئے جنہوں نے "متفقہ مطالبہ اسلامی نظام" پیش کیا ہے۔ ان سے بھی کہئے کہ وہ اس سوال کا جواب تحریر فرما دیں کہ اسلام کیا ہے؟ پھر اس کے بعد دیکھئے کہ ان "متفقہ مطالبہ" پیش کرنے والوں کے جوابات کہاں تک ملتے ہیں۔

جب اسلام کے متعلق "دین داروں" اور "دنیا داروں" کی کیفیت یہ ہو تو اُن سے اسلامی دستور کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ ع

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

اگر ہمارے ارباب حل وعقد میں صحیح ولولہ اور صحیح ذوق ہوتا تو کرنے کا کام صرف اس قدر تھا کہ قرآن کو سامنے رکھ لیا جاتا اور اس سے اسلام کے بنیادی اصول متعین کر لئے جاتے۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق آئین مرتب کر لیا جاتا۔

ہم آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ اگر یہ حضرات خود اس کے اہل نہیں ہیں تو طلوع اسلام انہیں قرآن سے اسلام کے بنیادی اصول مرتب کر کے دیسکتا ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں آپ فی الواقعہ کوئی ایسی چیز پیش کر سکتے ہیں جس کے متعلق آپ کہہ سکتے

کہ اس کی مثیل اور نظیر کوئی اور نہیں پیش کر سکتا۔ ورنہ جو کچھ ان سفارشات میں کہا گیا ہے اگر وہی اسلامی دستور ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس میں کونسی ایسی چیز ہے جو اور لوگوں کے ہاں موجود نہیں ہے۔ بجز قرآن و سنت کے الفاظ، اور مجالسِ علماء کے وجود کے جس سے ازمنۂ متوسطہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر آئین سازی کا کام مولویوں کے ہاتھ میں دیدیا گیا تو وہ ایسا کچھ پیش کریں گے جس پر ساری دنیا ہنسے گی۔ اور آپ ایک ایسی دلدل میں پھنس جائیں گے جس سے نکلنا آپ کے لئے ناممکن ہوگا۔

لہٰذا یا تو اپنی رہنمائی کے لئے خدا کی وحی سے روشنی لیجئے اور اگر اس کی ہمت یا توفیق نہیں ہے تو پھر اپنی عقل اور فکر سے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح آئین مرتب کر لیجئے۔ اس سے اگر آپ خدا تک نہیں پہنچیں گے تو کم از کم آدمیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل تو ہو جائیں گے۔

دیکھئے۔ اپنا نمبر خریداری تلاش کیجئے

جنوری ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہٰذا آئندہ ماہ فروری ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ جنوری سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا

۵۲ — ۲۵۹ — ۴۲۹ — ۴۳۱ — ۴۳۲ — ۴۳۵ — ۴۴۴ — ۴۴۷ — ۴۵۱ — ۴۵۵ — ۴۶۳ — ۴۷۱
۴۷۳ — ۴۷۶ — ۴۸۷ — ۶۶۰ — ۶۷۹ — ۶۸۹ — ۶۹۰ — ۶۹۱ — ۶۹۳ — ۶۹۶ — ۶۹۸ — ۷۰۱ — ۷۲۳
۷۲۴ — ۷۲۶ — ۷۲۷ — ۷۲۹ — ۷۳۱ — ۷۳۳ — ۷۳۴ — ۷۳۵ — ۷۳۶ — ۷۳۷ — ۷۳۸ — ۷۳۹
۷۴۰ — ۷۴۱ — ۷۴۲ — ۷۴۳ — ۷۴۴ — ۷۴۵ — ۷۴۶ — ۷۴۷ — ۷۵۲ — ۷۵۳ — ۷۵۷ — ۷۵۹ — ۷۶۰ — ۷۱۲
۷۶۲ — ۷۶۴ — ۷۶۵ — ۷۶۶ — ۷۶۷ — ۷۶۸ — ۷۷۱ — ۷۷۲ — ۷۷۶ — ۷۸۸ — ۸۱۱ — ۸۱۳ — ۸۱۴ — ۸۱۵
۸۱۶ — ۸۱۷ — ۸۱۸ — ۸۱۹ — ۸۲۱ — ۸۲۹ — ۸۴۶ — ۸۴۷ — ۸۸۵ — ۹۰۹ — ۱۰۰۴ — ۱۰۰۵ — ۱۰۰۶ — ۱۰۱۶
۱۰۲۱ — ۱۰۲۷ — ۱۰۵۵ — ۱۰۵۶ — ۱۰۵۷ — ۱۰۵۹ — ۱۱۴۰ — ۱۱۴۱

سلیم کے نام....

(مقامِ محمدی)

پرویز

ہاں سلیم! اس میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں تقریبیں دو ہی ہیں، ایک میلاد النبی کی عید اور دوسری نزولِ قرآن کی عید۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو یہ دونوں تقاریب بھی درحقیقت ایک ہی تقریب کے دو رُخ ہیں۔ دنیا کی بھول ہے کہ اس نے ان تقاریب کو صرف مسلمانوں کی تقاریب سمجھ رکھا ہے۔ یہ درحقیقت پوری کی پوری انسانیت کی تقاریب ہیں۔ اس لئے یہ تقاریب نہ کسی شخصیت سے وابستہ ہیں نہ کسی خاص قوم سے۔ نہ زمان کی قید میں محدود ہیں نہ مکان کی حدود میں محصور۔ یہ وہ تقاریب ہیں جن سے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ مواقع ہیں جہاں کاروانِ آدمیت، اپنے سفرِ زندگی میں ایک نیا موڑ مڑا ہے۔ یہ تقاریب درحقیقت ایک حد فاصل ہیں دنیائے قدیم اور دنیائے جدید میں۔ اس مقام پر انسانی زندگی کے پرانے اسلوب و انداز ترک کر کے رکھدئے گئے اور اس کے سامنے علم کے نئے مقامات، فکر کی نئی راہیں اور ارتقا کی نئی منزلیں بے نقاب کر دی گئیں۔ اسلئے یہ تقریبیں کسی خاص قوم کی تقریبیں نہیں، پوری نوعِ انسانی کی تقریبیں ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا، خاک کے ذرے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پیکرِ انسانی میں جلوہ بار ہوئے۔ اب انسان کے سامنے زندگی کی ممکنات کا جو انتہائی مقام ہے وہ مقامِ محمدی ہے۔ [مقامِ نبوت نہیں بلکہ سیرتِ محمدی کا مقام] یہی وجہ ہے کہ میں نے معارف القرآن کی چوتھی جلد کا نام معراجِ انسانیت رکھا تھا۔ اسلئے کہ سیرتِ محمدی درحقیقت معراجِ انسانیت کی آئینہ دار ہے۔ خدا سے نیچے اور ساری کائنات سے اوپر، یہ ہے مقامِ محمدی۔ افسوس یہ ہے کہ انسان نے ابھی تک مقامِ محمدی کو پہچانا نہیں (اور اس کے ذمہ دار خود ہم مسلمان ہیں جنہوں نے اس مقام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش نہیں کی) جس دن انسان نے اس مقام کو پہچان لیا، یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا اور دنیا ایک بار پھر اُس حیات بخش و جانفزا منظر کو اپنے سامنے دیکھ لیگی جسے خاکِ حجاز کے ذروں نے تیرہ سو برس پہلے دیکھا اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے آسمان آجتک سرگرداں ہے۔

پہلے تو یہ دیکھو سلیم! کہ وحی کسے کہتے ہیں اور نبوت کا مقام کیا ہے؟ اس کے لئے ذرا اس واقعہ کو پھر سے سامنے لاؤ جو تم نے پچھلی مرتبہ مجھ سے بیان کیا تھا۔ اگر میں بھولتا نہیں تو تم نے بتایا تھا کہ اس میں خریدار اور دکاندار کی باہمی گفتگو کچھ اس قسم کی تھی۔

خریدار — تم نے ابھی صبح کہا تھا کہ اس کی قیمت چار روپے ہے۔ اب پانچ روپے مانگ رہے ہو؟

دکاندار — وہ صبح کی بات ہے۔ اب اس کے دام بڑھ گئے ہیں۔

خریدار۔ لیکن جب میرے ساتھ تم نے چار روپے طے کر لئے تھے تو پھر اب مجھ سے پانچ کیوں مانگتے ہو؟ تمہیں اپنی بات پر قائم رہنا چاہئے۔
دکاندار۔ طے اس وقت کیا تھا۔ اگر تم اسوقت لے جاتے تو اور بات تھی۔ اب وہ بات گئی۔ اب تو پانچ روپے ہوں گے۔
یہی بات تھی ناں! جو باہمی کشاکش سے بڑھتے بڑھتے چپقلش اور اس سے آگے دست و گریبان تک پہنچ گئی تھی۔

لیکن یہ بات اس خاص خریدار اور دکاندار کی نہیں۔ ہر انسان کا مزاج "تاجرانہ" واقعہ ہوا ہے اور تاجرانہ مزاج کے معنی ہی یہ ہیں کہ گاہک اپنا نفع سوچے اور دکاندار اپنا۔ بلی اپنی گھات میں اور چوہا اپنی گھات میں۔ جب گاہک کہتا ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر قائم رہنا چاہئے تو (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس کا یہ مطالبہ بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں اُس کا فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی انسان اصول کا مطالبہ بھی اسوقت کرتا ہے جب وہ دیکھے کہ اس اصول پر قائم رہنے سے اس کا فائدہ ہے۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے اور انسان ہر جگہ یہی کچھ کرتا ہے۔ یہ انسانی عقل کا تقاضا ہے۔ جو شخص اپنا نقصان کرتا ہے، دنیا اسے بیوقوف کہتی ہے۔ جو اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے اسے عقلمند قرار دیا جاتا ہے یعنی مفاد خویش کا تحفظ، عقل کا تقاضا ہے۔ اور اپنے فائدے کا خیال نہ کرنا بے عقلی کی علامت۔ اس مقامِ سود و زیاں میں اصول اور بے اصولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر عقل دیکھتی ہے کہ اس کا فائدہ پچھلے مقام سے ہٹنے میں ہے تو وہ اُس مقام سے بلا تامل ہٹ جاتی ہے اور اپنی اس جدید روش کے جواز میں نئی نئی دلیلیں تراشتی اور بہانے ڈھونڈھتی ہے۔

زباں زباں شکند آں چہ می تراشد عقل

یہی عقل کا کاروبار ہے۔ یہی اس کا وطیرہ ہے۔ عقل مفادِ خویش سے الگ ہٹ کر سوچ ہی نہیں سکتی۔

لیکن اگر دنیا میں یہی ہوتا رہے کہ ہر شخص جب جی چاہے اپنے مقام سے ہٹ جائے، تو دنیا میں کوئی نظم قائم نہ رہ سکے۔ تم دیکھتے ہو سلیم! کہ کاروباری دنیا نے اپنے لئے کچھ کاروباری اصول بنا رکھے ہیں۔ ان کے تمام کاروبار کا چلن ان اصولوں کی پابندی میں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو اصول کی پابندی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنی کاروباری ساکھ کو قائم رکھنا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اپنے فائدے کے لئے اصول شکنی اور عہد فراموشی پر اُتر آتا ہے تو کاروباری دنیا میں اس کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ کسی معاشرہ میں لوگ جتنے زیادہ زبان اور اصول کے پابند ہوں گے وہ معاشرہ اتنا ہی زیادہ امن اور سلامتی کا معاشرہ کہلائے گا۔ اس میں ایک فرد دوسرے پر اعتماد کر سکے گا۔ اور باہمی اعتماد اور بھروسے کی زندگی ہی اطمینان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

اب سلیم! ہمارے سامنے دو باتیں آگئیں۔

(۱) عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہم دیکھیں کہ کسی اصول پر قائم رہنے سے نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اس اصول سے پھر جانا چاہئے۔ اگر ہو سکے تو دلیل سازی اور بہانہ تراشی کی فریب کاری سے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر دھاندلی سے۔

(۲) لیکن معاشرہ کا امن و سکون کا تقاضا ہے کہ باہمی معاملات ایسے اصولوں کی رو سے طے ہوں جو ہر فرد کے مفاد کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بدلتے نہ رہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اصول وضع کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی چیز ہے۔ غیر متبدل اصولِ زندگی

وضع کرنا اس کے احاطہ سے باہر ہے۔

اب تم آفاقی کائنات (OUTER UNIVERSE) میں غور کرو سلیم! تم دیکھو گے کہ وہاں کوئی چیز خود فیصلہ نہیں کرتی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ان سب کے لئے پہلے سے اصول مقرر ہیں جن کی پابندی از خود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی صبح سورج یہ فیصلہ کرلے کہ میرا فائدہ اس میں ہے کہ میں دیر سے طلوع ہوں اور زمین یہ فیصلہ کرلے کہ میں آج کچھ دیر کے لئے آرام کرلوں۔ ان کے لئے اصول اور قوانین متعین ہیں اور ان کی فطرت کے اندر داخل ہیں۔ ایک بکری کی فطرت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ لیکن اس باب میں انسان ان سب سے الگ ہے۔ اس کی "فطرت" کے اندر کوئی اصول ودیعت کرکے نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ میں تمہیں اس سے پہلے تفصیلی طور پر ایک خط میں لکھ چکا ہوں، انسان کی "فطرت" میں کچھ نہیں، اس کی زندگی کا جتنا حصہ حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) سے متعلق ہے، وہاں وہی طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) جبلی طور پر (BY INSTINCT) کارفرما ہیں جو دوسرے حیوانات میں عمل پیرا ہیں۔ بھوک کے وقت کھانے کا تقاضا۔ پیاس میں پانی کی طلب۔ تکان کے بعد آرام اور نیند کی خواہش طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن جہاں تک اس کی زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) کا تعلق ہے، اس کی "فطرت" میں کوئی اصول اور قوانین نہیں رکھے گئے جن کی پابندی از خود، فطرۃً (BY NATURE) ہوتی جائے۔

اب صورتِ حال یوں ہوئی سلیم! کہ

(i) انسانی معاشرہ میں امن و توازن کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد معاشرہ ایسے اصولوں کی پابندی کریں جو ان کی عقل کے مفاد پرستانہ تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے نہ رہیں۔

(ii) ان اصولوں کا وضع کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔

(iii) نہ ہی یہ اصول انسان کی فطرت کے اندر از خود موجود ہیں۔

اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو "بے اصولا" ہی چھوڑ دیا گیا ہے؟ ایسا نہیں کیا گیا۔ ایسا کرنا تو اس پر بڑی زیادتی ہوتی۔ اسے زندگی کے غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں لیکن ان کے دینے کا ذریعہ مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ وہ ذریعہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض کو چن لیا جاتا اور انھیں ان محکم اصولوں کا علم دیدیا جاتا۔ ایسے انسانوں کو نبی اور اس ذریعہ علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وحی نہ تو عقل کی پیداوار ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ نبی کی "فطرت" کے اندر ہوتی ہے جو ایک وقت کے بعد نمودار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ نبی، انسان ہوتا ہے اور (یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ) ایسے اصولوں کا علم انسان کی "فطرت" کے اندر موجود نہیں۔ اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ وحی اکتسابی شے نہیں، وہبی ہے۔ یعنی، یہ نہیں کہ وحی کا امکان (Possibility) انسان کی فطرت کے اندر ہوتا ہے اور جو انسان چاہے اس صلاحیت (FACULTY) کو نشوونما دیکر (DEVELOPE کرکے)

ایک دن نبی بن جائے۔ میرزا غلام احمد نے وحی کی ماہیت ہی کو نہیں سمجھا اس لئے یہ دعویٰ کر دیا کہ میں ذاتی کوشش سے، بتدریج، اکتسابی طور پر مقام نبوت تک آپہنچا ہوں۔ تمہاری حیرت بجا ہے سلیم! کہ جو شخص وحی کی بنیادی خصوصیت تک کو نہیں سمجھ سکا، مسلمانوں کا ایک طبقہ اُسے بھی نبی ماننے لگ گیا۔ لیکن اس میں حیرت و استعجاب کی کونسی بات ہے؟ تم ذرا دیکھو کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں نے آج متبعین (Followers) کی اتنی اتنی بڑی تعداد اپنے پیچھے لگا رکھی ہے اور اس طرح بڑی بڑی جماعتوں کے مرکز بن کر بیٹھے ہیں، ان کی علمی اور ذہنی سطح کیا ہے؟ اگر یہ لوگ کسی سمجھدار قوم میں پیدا ہوتے تو ہوشمند طبقہ انھیں اپنے پاس نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن یہی لوگ ہیں کہ اس قوم میں لیڈر بن رہے ہیں اور لیڈر بھی اس انداز کے کہ دنیا بھر کے علوم و فنون سے متعلق مسائل (Problems) ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان علوم کی ابجد تک سے واقف نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود، نہایت مجتہدانہ انداز سے، ان مسائل کا حل تجویز کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے یہ جوابات اس انداز کے ہوتے ہیں جن پر علم ہنسے اور عقل ماتم کرے۔ لیکن بایں ہمہ، ان کے معتقدین کا حلقہ ہے کہ اس پر سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کہتے نہیں تھکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو قوم تقلید کی خوگر ہو جائے اس میں علم اور جہالت میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے وہ ہر ڈگڈگی بجانے والے کے پیچھے ہو لیتی ہے۔ اندریں حالات، اگر اس قوم میں سے کچھ لوگ "نبی قادیان" کے پیچھے بھی لگ گئے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے! اگر یہ لوگ اس کے پیچھے نہ لگتے تو کسی اور جماعت کے مذہبی لیڈر کے پیچھے لگ جاتے۔

نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن است

ہاں! میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ انسانوں کو غیر متبدل اصولِ زندگی کا علم دینے کے لئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ بعض انسانوں کو یہ علم، وحی کے ذریعے عطا کر دیا گیا اور انھیں اس پر مامور کر دیا کہ وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچا دیں۔ اس علم (وحی) کے ملنے کو نبوت کہتے ہیں اور اسے دوسروں تک پہنچانے کو رسالت۔ نبوت ختم ہو چکی ہے کیونکہ انسانیت کے لئے جتنے محکم اصولوں کی ضرورت تھی انھیں آخری مرتبہ ایک کتاب (قرآن) میں محفوظ کر کے دیدیا گیا۔ باقی رہا ان اصولوں (یعنی قرآن) کا دوسروں تک پہنچانا، سو یہ فریضۂ "رسالت" قرآن ماننے والوں کے سپرد کر دیا گیا۔

دیکھو سلیم! وحی کی اس حقیقت کو آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے بادیہ نشینوں کو کس انداز سے سمجھایا گیا؟ وہ خانہ بدوش، صحرانورد قوم تھی۔ عمر بھر سفر میں رہتی۔ آج یہاں، کل وہاں۔ سفر بھی صحرا میں، جہاں نہ سڑکیں ہیں نہ روشیں۔ نہ راستے ہیں نہ راستوں کے نشان۔ اگر کسی جگہ کسی پہلے جانے والے کے پاؤں کے نشان پڑ گئے ہیں تو ہوا کے ایک تیز جھونکے نے انھیں بھی ریت کے نیچے دبا دیا۔ ایسے "راستے" اور ان میں سفر۔ اور سفر بھی بالعموم راتوں کو۔ سوچو سلیم! کہ اندھیری راتوں میں ایسے صحراؤں میں کس طرح سفر کیا جاتا تھا؟ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں؟ عقل سے معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ پرندوں کی طرح یہ چیز "فطرت" کے اندر موجود نہیں کہ فضا کی پہنائیوں میں ہزار ہا میل کا سفر کر رہے ہیں اور کبھی راستہ نہیں بھولتے۔ اُن صحرانوردوں کو لامحالہ کسی خارجی نشانِ راہ (ہدایت) کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ خارجی نشاناتِ راہ ایسے ہونے چاہئیں تھے جو راستہ دکھانے میں کبھی غلطی نہ کریں۔

جو اپنی جگہ پر محکم ہوں۔ یہ نشاناتِ راہ کیا تھے؟ آسمان کے ستارے! یہی ان کے دلیلِ راہ بنتے تھے۔ یہی ان کے لئے حضرِ طریقت تھے۔ یہ ایسے محکم اور غیر متبدل (SIGN POSTS) تھے جنکی راہنمائی میں کوئی دھوکا نہیں تھا، کسی غلطی کا امکان نہ تھا۔

یہ تھے صحرا نورد، عرب، قرآن کے اولیں مخاطب۔ ان سے کہا گیا کہ تم جاننا چاہتے ہو کہ تمہیں جو راہ نمائی (ہدایت) وحی کے ذریعے دی جا رہی ہے وہ کسقدر قابلِ اعتماد ہے؟ اس کے جواب میں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق تمہارا تجربہ اور مشاہدہ کیا کہتا ہے؟ کیا وہ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ وہ ہر رات اپنی روش بدلتے رہتے ہیں یا یہ کہتا ہے کہ ان کی راہ نمائی غیر متبدل اور انتہائی درجے کی قابلِ اعتماد ہے! تمہارا جو جواب ستاروں کی رہنمائی کے متعلق ہے، وہی جواب وحی کے متعلق سمجھ لو۔ اس لئے کہ اس رسول کو وحی بھی اسی مقام سے ملتی ہے جہاں سے ستاروں کو اپنی محکم روش پر چلنے کی وحی ملتی ہے۔

والنجم اذا ھوٰی (۵۳)

ستارہ جو اپنی محکم روش پر چلتا چلتا غروب ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ . . .

کس حقیقت پر شاہد ہے؟ اس حقیقت پر کہ (ما ضل صاحبکم وما غوٰی۔ ۵۳) یہ تمہارا رفیقِ راہ، جو سفرِ زندگی میں تمہاری راہ نمائی کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ نہ تو راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا لینے کے بعد اسے کھو سکتا ہے۔ اس لئے کہ (وما ینطق عن الھوٰی ۵۳) وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے خیالات کی رُو سے نہیں کہتا۔ بلکہ (ان ھو الا وحی یوحٰی ۵۳) ان محکم اصولوں کو بیان کرتا ہے جو اس کی طرف وحی کئے جاتے ہیں۔ اسے یہ وحی اُسی مقام سے ملتی ہے جہاں سے ستارے کو وحی عطا ہوتی ہے (علمہ شدید القوی ذو مرۃ ۵۳) اس خدا کی طرف سے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور زندگی کی تمام گذرگاہوں سے واقف۔ تم اس کی قوتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ ستاروں کی دنیا میں ہر روز کرتے ہو۔ آسمان کی اتنی بڑی وسیع و عریض کائنات اور اس میں ایسے ایسے عظیم الجثہ کرے کس طرح سر جھکائے اس کے قانون کی اطاعت میں محوِ خرام ہیں۔

ستاروں کی یہ راہ نمائی، جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے، عرب کے صحرا نشینوں کیلئے قانونِ خداوندی کے محکم اور اٹل ہونے کی ایک بیّن دلیل تھی، اسی طرح آج، سمندری بیڑوں اور ہوائی جہازوں کے قائدین (PILOTS) کے لئے ایک واضح برہان ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے۔ یہ دلیل جس طرح چودہ سو سال پہلے کی غیر مہذب، جاہل دنیا کے لئے سرمۂ چشم تھی، اسی طرح آج آئن سٹائن اور جیمس جینز کے لئے وجۂ بصیرت ہے۔ میں نے تمہیں فلکیات کے متعلق جیمس جینز کی کتاب بھیجی تھی۔ تم نے دیکھا تھا کہ یہ دورِ حاضر کا جلیل القدر ریاضی دان، ستاروں کی گذرگاہوں کا تماشا دیکھ کر کس طرح محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور قانونِ خداوندی کی ہیبت و جبروت کے سامنے کس طرح، قدم قدم پر سجدہ ریز ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں سے نبی اکرمؐ کو وحی عطا ہوئی۔ وحی کے اس علم نے، رسول کی ذات میں پورا پورا اعتدال اور توازن پیدا کر دیا (فاستوٰی ۵۳) اور اس طرح وہ علم کی ان بلندیوں تک جا پہنچا جہاں عقلِ انسانی کی رسائی ناممکن ہے (وھو بالافق الاعلٰی۔ ۵۳) تم قطب مینار پر چڑھے تھے سلیم! تم نے دیکھا تھا کہ وہاں پہنچکر انسان کی نگاہ کا دائرہ کسقدر وسیع ہو جاتا ہے۔ مینار کے نیچے کھڑے ہو کر

انسان زیادہ سے زیادہ سو پچاس گز تک دیکھ سکتا ہے لیکن وہی انسان مینار کے اوپر چڑھ کر میلوں تک کی دنیا کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ انسان وہی ہوتا ہے فقط مقام کی پستی اور بلندی اس کی نگاہ میں اتنا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ نبی کے لفظی معنی ہیں مقامِ بلند پر کھڑا ہونے والا۔ (وھو بالافق الاعلیٰ) علم کی اس بلندی پر کھڑا ہو کر نبی حقائق کائنات سے قریب تر ہو جاتا ہے اور ان کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے (ثم دنا فتدلیٰ ۵۳/۸) ARCHBISHOP TEMPLE نے لکھا ہے کہ قلب انسانی کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ اس کے اندر علم حاصل کرنے کی استعداد کسقدر ہے۔ اس پر (JOAD) یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر انسان کی نگاہ میں وسعت زیادہ ہو تو وہ فلاسفر کہلاتا ہے اور اگر گہرائی زیادہ ہو تو تخلیقی سائنسدان یا فطین۔ اس پر قرآن کا اضافہ یہ ہے کہ جس کی نگاہ میں وسعت اور گہرائی دونوں ہوں وہ نبی ہوتا ہے۔ نبی ان حقائق کا علم حاصل کرنے کے بعد اُن سے ایسا ہم آہنگ ہو جاتا ہے جیسے دو کمانیں اکٹھی ملی ہوں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ ہم آہنگ (فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔ ۵۳/۹) عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو آدمی باہمی رفاقت اور یک رنگی کا معاہدہ کرتے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں اکٹھی کرتے اور اس طرح دو کمانوں کی ایک کمان بنا کر ملکر ایک تیر چلاتے۔ یہ نشان (SYMBOL) ہوتا ان کے دو قالب ویک جان ہونے کا۔ (قاب قوسین) میں کئی ایک خطوط میں اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں کہ انسانی دنیا میں انسان اور خدا کا تعلق باہمی رفاقت کا تعلق ہے (خدا رفیقِ اعلیٰ ہے)۔ جب انسان کا ارادہ اور عمل قانونِ خداوندی کی رفاقت میں کام کرتا ہے تو کائنات میں تخلیقی اضافے (CREATIVE ADDITIONS) ہوتے جاتے ہیں اور اس کا حسن و توازن بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے خود انسان کی ذات ایک متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) بن جاتی ہے۔ یہ ہے وحی سے مقصود۔ اور یہ ہے مقامِ نبوت۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سلیم! رسول اللہؐ کی نبوت تاریخ میں ایک ایسے مقام پر آتی ہے جہاں سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ قرآن سے پہلے ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا اس لئے اس سے حقیقت، دلیل و برہان کی رو سے نہیں منوائی جا سکتی تھی۔ اس کیلئے بعض اوقات اس قسم کے ذہنی اکراہ (MENTAL COMPUSION) کی ضرورت پڑتی تھی جیسے معجزات۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے بچوں سے بات منوائی جاتی ہے۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد مشیت نے اپنے طریق (PROCESS) میں تبدیلی کر دی اور اب حقیقت کو معجزات کی بجائے دلیل و برہان کے زور پر پیش کیا گیا۔ اور کہدیا گیا کہ جسے ماننا ہے علم و بصیرت کی بنا پر مانے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے بار بار مطالبہ کے باوجود قرآن اعلان کئے جاتا ہے کہ ہم نے اس آخری نبی کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا۔ اس کا معجزہ اس کی وحی (قرآن) ہے جو علم کی بنیادوں پر نازل کیا گیا ہے اور علم ہی جس کا معیارِ شناخت ہے۔ قرآن نے تو یہ کچھ کہا لیکن مسلمانوں نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر کے رسول اللہؐ کے معجزات وضع کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ہماری کتب سیرت میں ہزارہا معجزات رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ (بعض نے تو یہ بھی کیا ہے کہ تمام انبیاءِ سابقہ کے معجزات گنا کر ان سے دُگنے معجزات رسول اللہؐ کے ثابت کر دیئے اور اس طرح خوش ہو گئے کہ ہم نے تمام انبیاءِ سابقہ پر حضورؐ کی برتری ثابت کر دی ہے۔)

یہی معجزات تصوف کی خانقاہوں میں پہنچ کر کرامات کی شکل میں سامنے آنے شروع ہو گئے اور "دین کی حقانیت" کا معیار قرار پا گئے۔

حالانکہ ان کرامتوں سے کہیں زیادہ محیرالعقول کرامات، ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے ہاتھوں سے سرزد ہو جاتی ہیں، درآنحالیکہ یہ یوگی اور سنیاسی بت پرست ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کرامات محض فنی چیز ہے جس کا تعلق نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے۔ نہ توحید سے ہے نہ شرک سے۔ (ان امور کی تفصیل تمہیں معراجِ انسانیت میں مل جائے گی)۔

چونکہ مرزا صاحب کے سامنے قرآن نہیں تھا اور ان کا اسلام بھی وہی اسلام تھا جو مسلمانوں میں صدیوں سے مروج چلا آرہا تھا اور وہ نبوت کو بھی ازقبیلِ تصوف سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنے دعوےٰ نبوت کی بنیاد پیشگوئیوں پر رکھدی جو ازقبیلِ کرامات ہی ہیں۔ اگر ان کے سامنے حقیقی اسلام ہوتا تو کم ازکم یہ حقیقت ان پر کھل جاتی کہ مہدی اور مجدد کے تصورات یکسر غیر قرآنی اور عجمی اسلام کے پیدا کردہ ہیں۔

اس ضمن میں یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُمم سابقہ پر انکارِ صداقت کی پاداش میں عذاب طبعی (PHYSICAL) شکل میں آیا کرتا تھا۔ آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد قوموں کے اعمال کے نتائج، ان کے عروج و زوال کی شکل میں سامنے آنے تھے۔ (مرزا صاحب کے سامنے یہ حقیقت بھی نہ تھی اسلئے وہ اپنے مخالفین کا انجام طبعی موت کی شکل میں دیکھنے کے متمنی رہتے تھے)۔

لیکن امم سابقہ اور نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں ایک فرق ان سب سے گہرا اور اہم تھا۔ میں نے تمہیں کسی گذشتہ خط میں بتایا تھا کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ تصورات (IDEOLOGIES) کے ذریعے رونما ہوا کریگا اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوا کریگی۔ اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نزولِ قرآن (یعنی ختم نبوت) کے بعد اشخاص (INDIVIDUALS) کا دور ختم ہوگیا اور ان کی جگہ امتوں کا دور شروع ہوگیا۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ ختم نبوت کے بعد فریضۂ رسالت اور قرآنی معاشرہ کے لئے ایک امت کی تشکیل کردی گئی (وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس.... نیز۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس.... وغیرہ)۔

فرد کی بجائے امت کا خیال سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ دَور بھی افراد کا دور تھا لیکن حضرت ابراہیمؑ کی اس آرزو سے آپ کی دور نگہی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ آپ نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا مانگی کہ اے اللہ (ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک - ۲/۱۲۸)۔ ہماری نسل سے ایک ایسی **امت** پیدا کر جو تیرے قانون کی کامل متبع ہو۔ یہ آرزو قبل ازوقت تھی۔ انسانیت ہنوز اس دور میں نہیں پہنچی تھی جہاں اس کی کشود کار افراد کے بجائے امتوں (COMMUNITY ' PEOPLE) کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ لیکن اس آرزو کو شرفِ قبولیت عطا ہوگیا اور وہیں سے تشکیلِ امت کی بنیاد رکھدی گئی۔ چنانچہ اِس مقصدِ عظیم کے لئے آپ کے فرزند جلیل حضرت اسمٰعیل کو، تختِ جہانبانی کے بجائے تولیتِ کعبہ کے لئے مختص کرلیا گیا اور شام کی سرداری حضرت اسحٰق کے حصے میں آئی۔ اس کے بعد تم غور کرو سلیم! حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے افراد (انبیاء کرام) پیدا ہوتے رہے لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں کوئی ایک ممتاز فرد بھی سامنے نہیں آتا۔ لیکن اُن کی نسل سے حجاز میں ایک قوم تربیت پاتی رہی اور جب وہ پختگی تک پہنچ گئی اور انسانیت نئے دور کے لئے تیار ہوگئی تو شاخِ اسحٰق سے افراد کا سلسلہ ختم کرکے شاخِ اسمٰعیل میں ایک آخری فرد پیدا کردیا جس نے نظامِ انسانیت امت کے سپرد کردیا۔ اس طرح دعائے ابراہیمی اپنے

وقت پر جا کر مستجاب ہوئی اور دنیا میں افراد کی جگہ امم نے لے لی۔ اسی لئے قرآن میں اس انداز کو "ملت ابیکم ابراھیمؑ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کے ساتھ تشکیلِ امت کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ اس سے پہلے قومیں (جو درحقیقت قبائل ہی کی پھیلی ہوئی شکلیں تھیں) نسل اور وطن کے اشتراک سے بنتی تھیں۔ قرآن نے کہا کہ امت کی تشکیل اشتراک ایمان (IDEOLOGY) کی بنا پر ہوتی ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں یہ بھی ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ ایسا بڑا اصولی انقلاب کہ انسان اس تیرہ سو سال میں بمشکل اس کی اہمیت کو پہچان سکا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے پرانے تصورات (رنگ و نسل و وطن) کی بنا پر قوموں کی تشکیل کرتا رہا اور ہزار خون خرابے کے بعد اب کہیں جا کر اس کی سمجھ میں یہ بات آنی شروع ہوئی ہے کہ امت کی تشکیل وحدتِ تصور کی بنا پر ہونی چاہیئے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ نبوتِ محمدیہ سے کس طرح انسان کی تاریخ دو حصوں میں بٹ چکی ہے اور قرآن کے ساتھ کس طرح انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہو تا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے وہ زمانۂ قبل از قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے تو اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن دنیا خود زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی انقلاب کو اپناتی چلی جا رہی ہے۔ . . . . . اسلئے میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآنی انقلاب کا مستقبل موجودہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ ان غیر مسلم قوموں کے ہاتھوں میں ہے جو غیر شعوری طور پر اس کے قریب آتی چلی جا رہی ہیں۔ اگر ان کے سامنے قرآن، اس کے اصل رنگ میں پیش کر دیا جائے، تو مجھے بڑی توقع ہے سلیم! کہ وہ اسے قبول کرنے میں قطعاً تامل نہیں کریں گے ان قوموں کے مفکرین کے جو خیالات میرے سامنے آ رہے ہیں، میں ان سے اندازہ کرتا ہوں کہ وہ اس انقلاب کی تلاش میں کس طرح سرگرداں پھر رہے ہیں جو قرآن کی دفینوں میں پوشیدہ ہے۔ اس وقت ان کے سامنے قرآن نہیں۔ لیکن اگر ان کے سامنے قرآن پیش کر دیا جائے تو وہ اسے لپک کر لیں گے۔ اسلئے کہ وہ خود اس قسم کے انقلاب کی تلاش میں ہیں۔ جب ان کے سامنے قرآنی حقیقت آئیگی تو یہ چیز ان کے سدِ راہ نہیں ہوگی کہ یہ تعلیم اس تعلیم کے خلاف ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلی آ رہی ہے اور جو ہمارے اسلاف کا مسلک تھا۔ وہ قرآن کے پیش کردہ مسلک کو اس کی (Face Value) پر پرکھیں گے اور (On Merit) اس کا جائزہ لیں گے۔ یہی معیار قرآن نے اپنی صداقت کے لئے پیش کیا ہے۔ قرآن اس معیار پر پورا اترے گا اور چونکہ انھیں اب خود اس انقلاب کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے اس لئے وہ قرآنی انقلاب پر لبیک کہیں گے۔ یہ ہیں وجوہات میرے اس اندازے کے، کہ قرآنی انقلاب کی آماجگاہ غیر مسلم اقوام کے نشیمن بن سکیں گے۔ موجودہ مسلمانوں میں غالباً کوئی خطہ بھی اسے اپنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا[1]۔ اسلئے کہ تمام اسلامی ممالک ازمنۂ متوسطہ کے انسان۔ کے خود ساختہ مذہب کو ابدی حقیقتیں سمجھے بیٹھے ہیں اور ان سے ایک قدم ہٹنے، یا کم از کم ان پر غور و فکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ جس قوم کا اندازِ نگاہ (Attitude of Mind) یہ ہو کہ ہم کسی ایسی بات کے سننے

---

[1] میں ترکی کے جدید رجحانات کا بنظرِ غائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ اگر انھیں اب بھی قرآن مل جائے تو ان سے عمدہ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

تک کیلئے بھی تیار نہیں جو اس مسلک کے خلاف ہو جو ہم میں متوارث چلا آرہا ہے خواہ وہ بات خود قرآن ہی کی کیوں نہ ہو، وہ قوم قرآن سے کس طرح متمتع ہو سکتی ہے؟ مجھے سلیم! بیس برس ہو گئے اتنی سی بات کہتے ہوئے کہ بھائی! جو بات کہی جائے اسے علیٰ وجہ البصیرت (On its Merits) پرکھ کر دیکھو کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ جبکہ ہمارے پاس ہر بات کے پرکھنے کا معیار (قرآن) بھی موجود ہے لیکن اس تمام عرصہ میں اتنی موٹی سی بات مسلمان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ وہ بنیاد تھی جس پر قرآنی عمارت کو استوار ہونا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں یہ بنیاد ہی تیار نہیں ہو سکتی۔ ان کے برعکس غیر مسلم قومیں از خود اس مقام پر موجود ہیں جہاں سے قرآن اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے۔ یعنی اس کی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت پرکھنا۔ اسلئے جو کام یہاں شاید صدیوں تک بھی نہ ہو سکے گا، وہاں وہ کام پہلے سے ہو چکا ہے۔ قرآن زندہ قوموں کو دعوت دیتا ہے۔ (لینذر من کان حیاً۔ ۳۶) وہ قبرستان میں وعظ نہیں کہتا۔ وہ مردوں کو ملاؤں کے سپرد کرتا ہے اور خود ان قوموں کی تلاش کرتا ہے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

یہاں پہنچکر تمہارا وہ سوال خود بخود میرے سامنے آجاتا ہے کہ میں نے بھی اپنی عمر مردوں ہی کو وعظ سنانے میں صرف نہیں کر دی؟ اسوقت تو میں نے تمہاری بات ان سنی کر دی تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ بات تھی غور طلب! سعدی کہہ گیا ہے کہ

گاہ باشد کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (باقی تم خود سمجھ لو)

لیکن سلیم! اسے تو خود تم بھی تسلیم کرو گے کہ تم بھی بالآخر اسی فضا سے اُبھرے ہو۔ اور تمہارے جیسے کئی اور قلب سلیم ہیں جو اس وقت قرآن کی آواز کو اپنے لئے نشید حیات بنائے ہوئے ہیں۔ میری آہ نیم شبی اور نالہ سحرگاہی کا اتنا صلہ بھی کم نہیں۔

کیوں! کیا خیال ہے تمہارا؟

پرویز

(۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ)

کیا آپ نے صفحہ ۲ اور ۱۷ کے اشتہارات دیکھ لئے ہیں؟

یاد رکھئے

قرآنی لٹریچر کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دینا آپ کا دینی فریضہ ہے

باسمہ تعالیٰ

استوانۃ المصحف و صندوق المصحف

(مولانا علامہ تمنا صاحب عمادی)

میرے بعض ذی علم اعزہ واحباب نے زبانی بھی اور خطوط کے ذریعے بھی یہ دریافت فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب "احادیث جمع قرآن کی بے لوث تنقید" میں بعض باتیں ایسی لکھدی ہیں جن کی سند نہیں دی ہے۔ چنانچہ ایک عزیز نے اپنے خط میں یوں تحریر فرمایا ہے:

جمع قرآن والی کتاب میں آپ نے جو یہ دعوٰی کیا ہے کہ "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں قرآن کتابی شکل میں لکھا ہوا موجود تھا، اور اس کو "امام" یا "ام" کہتے تھے، جو ایک ستون کے پاس صندوق میں مسجد نبوی میں رکھا رہتا تھا۔ اور اس ستون کا نام "اسطوانۃ المصحف" پڑ گیا تھا۔ اور بعد میں یہی مصحف حضرت حفصہؓ کی تحویل میں دیدیا گیا تھا" ان امور کے لئے آپ نے کوئی سند پیش نہیں کی ہے بہرحال۔ ان تمام امور کا ثبوت درکار ہے۔ . . . . . الخ،

زبانی پوچھنے والوں کو تو میں نے زبانی جواب دیدیا اور گھر پر بلا کر سندیں بھی دکھادیں۔ مگر تحریری مستفسرین جنھوں نے خطوط کے ذریعے دریافت فرمایا ہے ان کا تحریری جواب مناسب ہے کہ طلوع اسلام ہی کے ذریعے ان تک پہنچا دیا جائے۔ تاکہ ناظرین طلوع اسلام میں سے اور بھی کسی کے دل میں یہ خلش ہو تو دور ہو جائے۔

سب سے پہلے یہ عرض کر دینا ہے کہ اس کتاب کا موضوع "صحاح کی احادیث جمع قرآن" کی صرف تنقید ہے "جمع قرآن کی تاریخ" اس کتاب کا موضوع نہیں اسلئے ناظرین کو دیکھنا چاہئے کہ اس میں احادیث جمع قرآن جو صحاح میں مذکور ہیں ان کی تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے یا نہیں؟ تنقید کی غرض یہ ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ واقعۂ جمع قرآن بعہد حضرت صدیق اکبرؓ اور واقعہ نقل مصاحف بعہد حضرت عثمان ذوالنورینؓ سرے سے غلط اور کذب وافترا ہے اور یہ قرآن جو ساری دنیائے اسلام میں پونے چودہ سو برس سے حفظاً، کتابۃً، تلاوۃً، قراءۃً، تعلیماً اور تعلماً بسبیل تواتر غیر منقطع عہد نبوی سے اسوقت تک چلا آرہا ہے، اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ مبارک میں اپنی نگرانی میں جمع کرا دیا تھا اور صحابہؓ کے پاس کتابی صورت میں قرآن موجود تھا جس کو دیکھکر صحابہؓ پڑھتے تھے اور اپنے بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے تھے۔ میں نے اس دعوے کے جتنے دلائل پیش کئے ہیں ان سے میرا یہ دعوٰی ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟ جو باتیں تاریخ جمع قرآن سے متعلق ضمناً مذکور ہوگئی ہیں بالفرض بے سند بلکہ غلط ہی سہی مگر اس سے اس کتاب کے اصل موضوع پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ صلعم پر نازل شدہ آیت کو لکھواتے تھے۔ ہر اتری ہوئی سورت کو لکھواتے تھے۔ تو جب آخری آیت اتر گئی تو پورا قرآن مجتمع ہو گیا۔ وہ چاہے رق منشور پر مجتمع ہوا ہو، چاہے کاغذ پر، چاہے ہڈی یا تختی یا کھال یا جھلی جس پر بھی ہو۔ بہرحال مجتمع ہوا۔

اس کو ام یا امام کہتے تھے یا نہیں کہتے تھے یہ اس کتاب کا کوئی اہم موضوع نہیں ہے۔ وہ صحیفے جو آپ نے لکھوائے تھے آخر کہیں نہ کہیں رکھے تو ضرور جاتے تھے۔ صندوق میں نہ سہی کسی کپڑے کی گٹھری ہی میں سہی۔ مسجد نبوی میں کسی ستون کے پاس نہیں تو ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے حجرے ہی میں سہی۔ ورنہ اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے؟ مجھکو سخت تعجب ہے کہ اب تک اسی قسم کے سوالات زبانی بھی ہوئے اور تحریری بھی آئے مگر نفس تنقید احادیث اور ان حدیثوں کے کذب و افترا ہونے کے دلائل پر اب تک کوئی کچھ نہیں بولتا۔ انداز یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب میں بس صرف ام یا امام اور اسطوانہ مصحف ہی کا چونکہ ثبوت سہواً درج نہ ہو سکا اسلئے ہر شخص بس صرف اسی کو زبانی بھی پوچھتا ہے اور تحریری بھی، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں باتوں کا کوئی ثبوت مصنف کے پاس نہیں ہے تو بس اسی کو لیکر پوری کتاب کو بے ثبوت و بے سند اور محض قیاس آرائی کہکر مشہور کر دیا جائے کہ تمنا نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل غلط اور مہمل لکھا ہے کسی بات کا کوئی ثبوت ہی پیش نہیں کیا۔ خدا کرے کہ یہ میرا سوءِ ظن ہو اور پوچھنے والوں کا یہ مقصد نہ ہو بلکہ واقعی دریافت حال اور ایک شبہ کا ازالہ ہی مقصود ہو۔ مگر مجھکو اس بدگمانی کی وجہ یہ ہوئی کہ ہر شخص اسطوانۂ مصحف و صندوق مصحف ہی کے ثبوت کو پوچھتا ہے ام یا امام کے متعلق تو صرف دو شخصوں نے دریافت کیا ہے اور یہ سارے پوچھنے والے علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، یا ایسے بالغ نظر انگریزی داں ہیں جن کی نظر کافی وسیع ہے اور وہ اسلامی تاریخ اور حدیث و تفسیر سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر عوام پوچھنے والے ہوتے تو مجھکو یہ بدگمانی نہ ہوتی۔ ہندوستان و پاکستان سے اب تک میرے پاس بائیس خط آچکے ہیں جن میں سے ہر خط میں اسطوانۂ مصحف اور صندوق مصحف پر مہذب و غیر مہذب طریقے سے سوال کیا گیا ہے۔ کراچی سے بذریعہ خط اور ڈھاکے میں زبانی صرف دو شخصوں نے ام اور امام کے بارے میں دریافت فرمایا ہے۔ بہرحال اب میں سوالی عبارت کا تجزیہ کرکے ہر ایک کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔

۱ "رسول اللہ صلعم کی حیاتِ مبارک ہی میں قرآن کتابی شکل میں موجود تھا" اس کا ثبوت کافی سے زیادہ میری کتاب میں موجود ہے۔ اگر کتاب کی صورت میں قرآن صحابہؓ کے پاس موجود نہ تھا تو رسول اللہ صلعم صحابہ کو مصحف دیکھکر پڑھنے کا ثواب بیس گونہ فرماکر کتاب دیکھکر پڑھنے کی ترغیب کس طرح فرماتے تھے؟ رسول اللہ صلعم صحابہ کو جہاد وغیرہ کے سفر میں مصحف ساتھ لیکر سفر کرنے سے کیوں منع فرماتے تھے؟ رسول اللہ صلعم نے باقیات الصالحات کے ضمن میں اس مصحف کا ذکر کیوں فرمایا جو میت اپنی میراث میں چھوڑ جائے اور اس کے ورثاء اس میں پڑھیں وغیر ذلک۔ اور ان سب کی سندیں اصل کتاب میں مذکور ہیں دیکھئے صفحات ۶۶ سے ۷۰ تک۔

۲ "رسول اللہ صلعم نے جو مصحف یا صحیفے لکھوا لکھوا کر جمع کرائے تھے ان کا نام ام یا امام پڑ گیا تھا" اس کا ثبوت ذرا بحث طلب ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے اس بحث کو میں ذیلی نمبروں میں عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ اس طرح بھی طوالت سے بچا نہ سکا پھر بھی فی الجملہ اختصار ضرور ہوگا۔

(ا) حضرت حفصہؓ کے پاس صحیفوں کی شکل میں پورے قرآن مجید کا ہونا مسلّم ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

(ب) کہا جاتا ہے کہ وہ صحیفے وہ تھے جن کو زید بن ثابتؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے اور حضرت صدیق اکبرؓ کے حکم سے جمع کیا تھا۔ جیسا کہ بخاری وغیرہ صحاح کی حدیثوں میں ہے۔ مگر ان حدیثوں کی زبردست تنقید کرکے روایۃً و درایۃً میں نے ہر طرح سے ثابت کر دیا ہے

کہ یہ حدیثیں موضوع بلکہ بخاری وغیرہ میں ملاحدۂ عجم کی داخل کردہ ہیں اور واقعۂ جمع صدیقی محض بے اصل بے بنیاد، کذب اور افترا ہے اور اس کے لیے ایسے ایسے قوی دلائل میں دے چکا ہوں جن کی تردید نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ صحیفے یقیناً جمع صدیقی والے تو تھے نہیں۔ تو پھر وہ کون سے صحیفے ہو سکتے ہیں بجز صُحُفِ نبوی کے؟

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر وہ جمع صدیقی والے صحیفے نہیں ہو سکتے تو حضرت حفصہؓ کے ذاتی صحیفے ہوں گے جن میں وہ تلاوت فرماتی تھیں۔ اسلئے کہ ان کے ذاتی صحیفوں کی کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں ہو سکتی کہ نقل مصاحف بعہد عثمانی کی حدیث گھڑنے والے صرف انھیں صحیفوں کے منگوانے اور انھیں کی نقل کرانے کا ذکر کرتے۔ ہر ام المومنین رضی اللہ عنہن کے پاس ایک مصحف تھا جس میں وہ تلاوت فرماتی تھیں اور پھر دوسرے اکابر صحابہؓ کے پاس بھی ان کے جمع کردہ مصاحف موجود تھے۔ نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث گھڑنے والا ہر جگہ سے مصحف منگوانے کا ذکر کرتا۔ مگر وہ واقف تھا کہ حضرت حفصہؓ کے پاس صحف نبوی تھے اس لئے اس نے نقل مصاحف بعہدِ عثمانی کی حدیث گھڑنے کے وقت صرف ارسلی الینا الصحف لکھا۔ صحف پر الف لام عہد کا ضرور ہے مگر اس کو مبہم رکھا کہ وہ کون سے صحف تھے، اور اس کا پتا بتانے کے لئے جمع صدیقی والی ایک الگ حدیث مستقل طور سے گھڑی۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یہاں الصحف پر عہد کا الف لام ہے اس سے مراد وہی جمع صدیقی والے صحیفے ہیں جن کو زید بن ثابت نے حضرت صدیق اکبرؓ کے حکم سے مرتب کیا تھا مگر دروغگو را حافظہ نباشد اگر واقعی کوئی ایسا صحیفہ ہوتا جسکو حضرت فاروق اعظمؓ کے مشورے سے حضرت صدیق اکبرؓ نے زید بن ثابت سے مرتب کرایا ہوتا تو نقل مصاحف بعہد عثمانی کی حدیث گھڑتے وقت اس حدیث کے گھڑنے والے کو ضرور یہ یاد آجاتا کہ حضرت حفصہ کے یہاں سے جن صحیفوں کے منگوائے جانے کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ تو خود زید بن ثابت ہی سے مرتب و جمع کرائے گئے تھے، اس بات کو میں خود جمع صدیقی والی حدیث کے گھڑنے کے وقت بیان کر چکا ہوں یا اگر کسی دوسرے نے وہ حدیث گھڑی تھی اور اس کو خبر ہوتی تو ضرور اس کا خیال کرتا۔ پھر انھیں زید بن ثابت پر یہاں تین تین قریشیوں کو مسلط کرنے کا ذکر نہ کرتا، اور اگر ذکر کرنا ہی تھا تو کم سے کم اس کو بھی ضرور ذکر کرتا کہ جب حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت پر نقل مصاحف کے وقت تین تین قریشی ماہرین لغت قریش و حافظین قرآن کو مسلط کیا تو زید نے چیں بجبیں ہو کر کہا کہ اصل نسخہ ام جس کو آپ متعدد مصاحف میں اس وقت نقل کرا رہے ہیں، وہ تو میرا ہی ترتیب دادہ و جمع کردہ ہے اور آپ سے پہلے دو اجل خلفائے راشدینؓ نے پسند فرما کر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اور آج اُسی کی صرف نقل کرانے میں مجھ پر تین تین قریشیوں کو مسلط کرایا جا رہا ہے؟ تابوت اور تابوہ کے جھگڑے کے وقت زید بن ثابت ضرور کہتے کہ ہم نے عہد صدیقی میں اسی منقول عنہ صحیفے میں تابوہ لکھا ہے جس کو آپ سے پہلے آپ سے افضل دو دو خلیفۂ راشد صحیح مان چکے ہیں اور اور وہ دونوں قریشی ہی تھے۔ آج ان تین قریشی نوجوانوں کو دو افضل البشر بعد الانبیاء خلفائے راشدین کے قبول و منظور کردہ لفظِ قرآن سے اختلاف کا کیا حق ہے؟ مگر حیرت ہے کہ زید بن ثابت اپنی شکست و ذلت چپ چاپ دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے! یہ بالکل خلافِ عقل ہے۔

(ج) اصل یہ ہے کہ جمع صدیقی والی حدیث اس لئے گھڑی گئی کہ جو صحفِ نبوی حضرت حفصہؓ کے پاس تھے ان کو صحفِ نبوی

کی جگہ صحفِ صدیقی ثابت کیا جائے، تاکہ اس کی وہ اہمیت محفوظیت باقی نہ رہے۔ اور نقل مصاحف بعہدِ عثمانی والی حدیث اس لئے گھڑی گئی کہ اختلافاتِ قرأت کا جو طوفان اٹھایا گیا ہے اور انزل القرآن علی سبعۃ احرف کا جو شور مچایا گیا ہے اس کے بغیر اس طوفان اور اس شور کا کوئی اثر نفس قرآن مجید پر نظر نہیں آتا، قرأت کے سات ذہنی اسکول قائم کئے گئے اور ہر اسکول کی قرارت میں دوسرے اسکول کی قرارت سے حرکات وسکنات ونقاط وحروف وکلمات کے سینکڑوں فرق بتائے جا رہے ہیں جن کی زبردست تبلیغ اور پروپیگنڈہ ہے مگر دنیا میں قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید قرآن مجید کے جتنے نسخے اسلاف واخلاف کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے ملتے ہیں، سب کے سب صرف ایک ہی قرارت کے مطابق ہیں۔ ان نسخوں میں جو تیرہ سو برس سے بلکہ بعضے اس کے بھی کچھ اوپر سے اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں کہیں ایک حرف ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔ ساری دنیا کے حفاظ قرآن ہر زمانے میں ایک ہی طرح پڑھتے چلے آئے اور آج تک ایک طرح سارے حفاظ پڑھ رہے ہیں۔ پھر کیا ہے کہ وہ اختلافِ قرارت کا سارا طوفان، اور سات حرفوں کی ساری ہنگامہ آرائیاں صرف کتابوں اور روایتوں ہی کے وہمی گوشے میں محدود نظر آتی ہیں؟ عملی دنیا میں کیوں مروج نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب۔ انزل القرآن علی سبعۃ احرف کا شور مچانے والوں، اور اختلاف قرارت کا طوفان اٹھانے والوں کے پاس کچھ نہ تھا اسلئے نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت گھڑی گئی کہ حضرت عثمانؓ نے ساری امت کو علی حرفٍ واحدٍ ایک قرارت کا پابند کر دیا اور دوسری قرارتوں کے مصاحف کو جلوا دیا یا دھلوا دیا۔ اس لئے دوسری ساری قراتیں صرف روایتوں کے گوشے میں محدود رہ گئیں اور تلاوت وقرارت وحفظ وتعلیم وتعلم وکتابت میں مصحفِ عثمانی کا رواج ساری دنیا میں ہو گیا۔ جس کو خود ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد میں لکھدیا ہے کہ اب باقی چھ قرارتوں کا وجود دنیا میں باقی نہ رہا کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ان کو بمشورہ صحابہ کرام بتقاضائے مصلحتِ وقت بالکل ضائع کرا دیا۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں تفسیر ابن جریر کی عبارت معہ ترجمہ نقل کر دیتا۔ مگر یہ بحث مفصل طور سے میری کتاب اعجاز القرآن میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی، ناظرین اس میں ملاحظہ فرمالیں گے اور علمائے وقت خود تفسیر ابن جریر کے اوائل میں انزل القرآن علی سبعۃ احرف کی بحث ملاحظہ فرمالیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمع صدیقی ونقل مصاحف بعہد عثمانی کی حدیثیں قطعاً موضوع وبے بنیاد ہیں مگر حضرت حفصہ کے پاس صحیفوں کا ہونا مسلّم ہے۔ تو وہ صحیفے یقیناً صحف نبوی ہی تھے، جن کو قرآن میں فی صحفٍ مکرمۃ فرمایا گیا ہے۔ یہ صحف نبوی ہی کو فرمایا گیا تھا نہ کہ صحف صدیقی کو جس کو بقول عبید بن سباق وفات نبوی کے بعد تنہا زید بن ثابت نے جمع کیا تھا۔

(د) وہ صحف یا صحیفے جو بھی کہیے، جو حضرت حفصہؓ کے پاس رہتے تھے ان کو امام یا ام کہتے تھے۔ کتاب فضائل القرآن میں محمد بن عثمان بن ابی شیبہ الکوفی (نسخہ قلمی کتب خانہ قاضی رضا حسین مرحوم پٹنہ سٹی ص۲۲) حدثنی ابی عن مطلب بن زیاد عن السدی عن انس بن مالک قال کان الصحف التی جمعہا ابوبکر تسمی اُمّاً۔ فہی کانت عندہ الی ان توفاہ اللہ ثم عند عمر حتی توفاہ اللہ ثم عند حفصۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ فلما اختلف الناس فی القرآن علی عہد عثمان حتی اقتتل الغلمان والمعلمون، فبلغ ذلک عثمان۔ فقال ہؤلاء عندنا یلحنون فی کتاب اللہ فمن نائی عنا یکون اکثر لحناً ویکذب بعضہم بعضاً۔ فیا اصحاب

رسول اللہ اجتمعوا فاکتبوا للکل مصر اماما یقتدون بہ ویصحون بہ مصاحفھم۔ ثم ارسل الی حفصۃ ان ارسلی الینا الام ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا الیک واخبرھا بما دعاہ الی ذلک فاستحسنت وارسلت الیہ الام فاستنسخ خمسۃ مصاحف ثم ارسل الی کل افق مصحفا وسماہ اماما لذلک الافق وامسک منھا مصحفا عندہ لیکون اماما لاھل المدینۃ۔ یعنی محمد بن عثمان بن ابی شیبہ الکوفی کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے باپ نے کہا، ان سے مطلب بن زیاد نے، ان سے اسمٰعیل السدی نے ان سے انس بن مالکؓ نے بیان کیا کہ وہ صحیفے جن کو ابوبکرؓ نے جمع کرایا تھا وہ اُمّ کہے جاتے تھے جو ان کی زندگی تک اُن کے پاس رہے پھر عمرؓ کے پاس اُن کی زندگی تک رہے پھر حضرت حفصہؓ کے پاس رہنے لگے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ تھیں تو جب بزمانہ حضرت عثمانؓ لوگوں نے قرآن میں اختلاف کرنا شروع کیا یہانتک کہ پڑھنے والے لڑکے اور قرآن پڑھانے والے آپس میں مارکاٹ کرنے لگے تو اس کی خبر حضرت عثمانؓ تک پہنچی تو انھوں نے کہا کہ یہ لوگ ہم لوگوں کے سامنے تو اللہ کی کتاب میں غلطیاں کرنے لگے، تو جو لوگ ہم لوگوں سے دور ہیں یا بعد میں آنے والے ہیں، وہ تو غلطیاں کرنے میں اور زیادہ ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کو جھٹلائے گا۔ تو اے رسول اللہؐ کے صحابیو! سب لوگ مجتمع ہو اور لکھو ہر شہر کے لئے ایک امام جس کی وہاں کے لوگ پیروی کریں، اور اس کے مطابق اپنے مصحفوں کو صحیح کرلیں۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس کسی کو بھیجا کہ ہمارے پاس نسخہ اُمّ کو بھیج دیجئے تاکہ ہم مصحفوں میں اس کی نقل اتار لیں۔ پھر اس نسخۂ اُمّ کو آپ کے پاس واپس کردیں گے اور جس سبب نے ان کو اس کام کی طرف متوجہ کیا اس سے ان کو مطلع کیا تو انھوں نے اس نقل مصاحف کے کام کو پسند کیا اور ان کے پاس نسخۂ اُمّ بھیج دیا تو حضرت عثمانؓ نے اس نسخۂ اُمّ کی نقل پانچ مصاحف میں کرالی اور پھر ہر افق کی طرف ایک مصحف بھیج دیا اور اس کو اس طرف کا امام نامزد کیا۔ اور ان مصاحف میں سے ایک مصحف اپنے پاس رکھ لیا تاکہ اہلِ مدینہ کے لئے وہ امام ہو۔

غالباً یہی روایت ہے جو مقتضب ہو کر یعنی کثرِ بیونت کے بعد کتاب المصاحف احمد بن اشتہ میں بطریق ایوب ابوقلابہ یعنی عبداللہ ابن زید سے مروی ہے جس کو سیوطی نے اتقان میں نقل کیا ہے۔ چنانچہ اتقان ج ۱ ص ۵۹ مطبوعہ مصر میں ہے:۔

عن ابی قلابۃ قال حدثنی رجل من بنی عامر یقال لہ انس بن مالک قال اختلفوا فی القرآن علی عھد عثمان حتی اقتتل الغلمان والمعلمون فبلغ ذلک عثمان بن عفان فقال عندی تکذبون بہ وتلحنون فیہ فمن نأی عنی کان اشد تکذیبا واکثر لحنا۔ یا اصحاب محمد اجتمعوا فاکتبوا للناس اماما۔ فاجتمعوا فکتبوا۔ . . . . الخ

یعنی ابوقلابہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا مجھ سے بنی عامر کے ایک شخص جس کو انس بن مالک کہا جاتا تھا اس نے کہا کہ عثمان کے زمانے میں لوگوں نے قرآن میں اختلاف کرنا شروع کیا یہانتک کہ لڑکے اور اساتذہ مارکاٹ کرنے لگے۔ اس کی خبر عثمان بن عفان تک پہنچی تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس تو تم لوگ اسکو جھٹلاتے ہو اور اس میں غلطی کرتے ہو، تو جو مجھ سے دور ہے یا میرے بعد آئیگا وہ تو اور سخت ہوگا جھٹلانے میں اور زیادہ ہوگا غلطی کرنے میں۔ اے اصحاب محمد (صلعم) مجتمع ہو اور لوگوں کیلئے ایک امام لکھ ڈالو۔ تو صحابہ مجتمع ہوئے اور انھوں نے لکھ ڈالا۔

دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھئے صاف معلوم ہو رہا ہے یہ دوسری روایت پہلی ہی روایت ہے مگر کٹی چھنٹی۔

یہ ابن اشتہ والی روایت یقیناً اسی محمد بن عثمان بن ابی شیبہ والی روایت کا شورٹ ہینڈ ہے۔ مگر اس امر کو چھپانے اور اس کو ایک الگ مستقل حدیث ثابت کرنے کی جو نامشکور سعی کی گئی ہے وہ قابل غور ہے۔ ابو قلابہ بنی عامر کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں جس کو بقول اُن کے انس بن مالک کہا جاتا تھا۔ اس طرح کہنے کے معنی یہی سمجھے جا سکتے ہیں کہ وہ کہنے والے انس بن مالک مشہور صحابی خادم رسول اللہؐ نہ تھے۔ مگر اسمٰعیل السدی صاف انس بن مالک اس طرح کہتے ہیں کہ وہی مشہور صحابی ہی سمجھے جائیں۔ مگر ابو قلابہ عبداللہ بن زید البصری حضرت انس بن مالک صحابی خادم رسول اللہؐ سے بھی روایت کرتے ہیں اور انس بن مالک الکعبی سے بھی جو قشیری بھی کہے جاتے ہیں اور وہ بھی صحابی تھے۔ باقی رہا بنی عامر ہونا تو دونوں بنی عامر کہے جا سکتے ہیں۔ قشیری بھی کیونکہ یہ قشیر بن کعب بن ربیعہ بن عامر کی اولاد سے تھے اور انس بن مالک خادم النبی صلعم انس بن مالک بن النضر بن ضمضم بن حزام بن جندب بن عامر تھے اس لئے صرف من بنی عامر کہدینے سے فرق و امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۲۶ ابو قلابہ کے آخر ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ھو عند الناس معدود فی البلہ وہ لوگوں کے نزدیک بیوقوفوں میں شمار کئے جاتے تھے اسلئے وہ اگر اس کو واضح نہ کر سکے کہ کس انس بن مالک سے یہ روایت کرتے ہیں، یا اسمٰعیل السدی والی حدیث کو کاٹ چھانٹ کر روایت کر دیں تو ان سے کچھ بعید نہیں۔

غرض محمد بن عثمان بن ابی شیبہ والی حدیث سے یہ پتا مل گیا کہ حضرت حفصہؓ کے پاس جو صحیفے تھے ان کو اُمّ کہتے تھے۔ اور میں اس کو اپنی کتاب میں بھی اور اس مضمون میں بھی ثابت کر چکا کہ حضرت حفصہؓ کے پاس صحف نبوی ہی تھے۔ باقی رہا امام کا لفظ تو جب نقل مصاحف بعہد عثمانی کا واقعہ بھی غلط ہی ہے تو یقیناً امام کا لقب بھی اگر مصاحف کو حاصل تھا تو اسی مصحف نبوی ہی کو حاصل تھا جو حضرت حفصہؓ کے پاس تھا۔ چاہے آپ صحف کہئے چاہے مصحف کہئے۔ یہ دونوں لقب صحف نبوی کے تھے جو عہد صحابہ میں جب تک وہ حضرت حفصہؓ کے پاس رہے لوگ انھیں اُمّ اور امام کے لقب سے یاد کرتے رہے۔ جب مروان نے اپنی ولایتِ مدینہ کے زمانے میں حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد عبداللہ بن عمرؓ سے ان صحیفوں کو لیکر دھوڈالا تو پھر نہ مسمے رہا نہ اسم، نہ ملقب رہا نہ لقب۔ اور جب اویان احادیث نے صحف نبوی ہی کے وجود سے انکار کر دیا تو پھر صحف نبوی کے نام و لقب کی تلاش ان کی حدیثوں میں سعی لاحاصل ہی ہے مگر میں نے جس بنیاد پر یہ لکھا کہ صحف نبوی کو ام یا امام کہتے تھے وہ یہی تھی کہ حضرت حفصہ کے پاس جو صحیفے تھے ان کو اُمّ کہتے تھے۔ اور وہ صحف نبوی ہی تھے۔ نقل مصاحف بعہد عثمانی کا واقعہ بھی بالکل غلط ہے۔ اس لئے اگر کوئی مصحف ایسا ہو سکتا ہے جس کو امام کہا جا سکے تو وہ صحف نبوی ہی تھے۔

(۸) نقل مصاحف بعہد عثمانی کا واقعہ اگر صحیح ہوتا تو انھوں نے چار یا پانچ یا سات جتنے مصاحف لکھوائے تھے ان میں سے کوئی تو کہیں موجود ہوتا۔ اس وقت نہ سہی، آٹھ سو نو سو برس بلکہ ایک ہزار برس کے محدثین و مورخین ان نسخوں میں سے کسی نسخہ مصحف کی زیارت کا ذکر ضرور اپنی کسی کتاب میں کرتے۔ وہ نسخہ امام جو اہل مدینہ کے لئے مدینے میں رکھ لیا گیا تھا وہ تو کہیں ہوتا۔ ہمارے وقت میں نہ سہی امام مالکؒ جو امام اہل مدینہ تھے وہ تو کہیں اس کا ذکر فرماتے! حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری حدیثیں ع

"اڑتی ہوئی خبر ہیں زبانی طیور کی"

۳۔ وعکے مسجد نبوی میں ایک ستون تھا جس کو اسطوانۃ المصحف کہتے تھے چونکہ اس ستون کے پاس مصحف رہا کرتا تھا اور وہ مصحف ایک صندوق میں رہتا تھا اور صندوق اس ستون کے پاس رکھا رہتا تھا۔ اور یہ واقعہ میرے نزدیک عہد نبوی کا ہے۔ وہ بھی زمانۂ ہجرت کے ابتدائی دور کا۔ پھر وہ مصحف غالباً معہ صندوق مسجد سے اٹھا کر حضرت حفصہؓ کے پاس رکھا گیا۔ میں نے یہ اپنی کتاب میں لکھا ہے اور اس کا ثبوت ضرور میرے ذمہ ہے۔ میرے پہلے مسودے میں بعض حوالے فٹ نوٹ میں منقول تھے۔ اوراق کی کہنگی سے آخر اوراق جھڑ گئے اور حوالے غائب ہوگئے یا ایسے ہوگئے کہ پڑھے نہ جا سکے۔ دوبارہ صاف کرنے والے نے وہ حوالے نقل نہ کئے۔

اب سنئے کتاب وفاء الوفاء جلد اول ص۳۱۱ میں ابن زبالہ سے مروی ہے کہ یزید بن ابی عبید کہتے تھے کہ ہم سلمہ بن الاکوع کے ساتھ مسجد نبوی میں چاشت کی نماز کے لئے آتے تھے فیعمد الی الاسطوانۃ دون المصحف فیصلی قریباً منہا۔ سلمہ کوشش کرتے تھے اس ستون کے پاس پہنچنے کی جو مصحف کے قریب تھا۔ اور اسی ستون کے قریب نماز پڑھتے تھے۔ (یہی حدیث سنن ابن ماجہ ص۱۰۲ میں یعقوب ابن حمید سے مروی ہے۔ اس میں صرف اس قدر اضافہ ہے کہ یزید سلمہ سے کہتے تھے اشارہ کرکے کہ یہاں کیوں نہیں پڑھتے؟ وہاں کیوں نہیں پڑھتے اسی ستون کے پاس کیوں پڑھتے ہیں؟ تو سلمہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا تھا کہ اس مقام پر نماز پڑھنے کی کوشش فرماتے تھے) اس کے بعد صاحب وفاء الوفاء لکھتے ہیں کہ بخاری میں بھی یہ حدیث ہے اور مسلم میں بھی ہے ان لفظوں سے اور دونوں کی عبارت نقل کی ہے اس لئے بہتر ہے کہ میں پہلے صحیح بخاری کی حدیث لکھ دوں اور پھر علامہ حافظ ابن حجر نے جو اس کی شرح فتح الباری میں کی ہے اس کو نقل کردوں۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوۃ الی الاسطوانہ: دیکھئے اس میں ثلاثیات امام بخاری کی تیسری حدیث ہے جس کو امام بخاری مکی بن ابراہیم سے۔ وہ یزید بن ابی عبید سے روایت کرتے ہیں کہ یزید نے کہا کہ

اتیت مع سلمۃ بن الاکوع فیصلی عند الاسطوانۃ التی عند المصحف فقلت یا ابا مسلم اراک تتحرّی الصلوۃ عند ھذہ الاسطوانۃ قال فانی رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتحری الصلوٰۃ عندھا۔

میں آیا سلمہ بن الاکوع (صحابی) کے ساتھ (مسجد نبوی میں) تو وہ نماز پڑھنے لگے اس ستون کے پاس جو مصحف کے پاس تھا تو میں نے کہا کہ اے ابو مسلم (یہ سلمہ کی کنیت تھی) میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم کوشش کرتے ہو اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کی تو انھوں نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

یہی حدیث اسی اسناد اور اسی عبارت کے ساتھ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں بھی موجود ہے۔ دیکھئے مسند احمد جلد چہارم ص۴۸۔ اور پھر دوسرے طرق سے بھی مسند احمد کی اسی جلد مگر ص۵۴ میں ہے جس کو امام احمد حماد بن مسعدہ سے وہ یزید بن ابی عبید سے روایت کرتے ہیں کہ

انہ کان یتحری موضع مکان المصحف وذکر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتحری ذلک المکان وکان بین المنبر والقبلۃ ممر شاۃ

یعنی سلمہ بن الاکوع نماز پڑھنے کیلئے کوشش کرتے تھے اس جگہ کی جو مصحف رکھنے کی جگہ تھی (یعنی جہاں مصحف رہتا تھا) اور ذکر کیا کہ رسول اللہ صلعم اسی جگہ نماز پڑھنے کی کوشش فرماتے تھے اور وہ جگہ منبر اور قبلہ کے درمیان ایک بکری کے آنے جانے بھر تھی۔

اور صحیح مسلم جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب سُتْرَۃُ المصلی ص۱۹۷ میں مسند احمد کی دوسری حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہے۔ صحیح مسلم کی عبارت یوں ہے:۔

... نا حماد بن مسعدہ عن یزید یعنی ابن ابی عبید عن سلمۃ وھو ابن الاکوع انہ کان یتحری موضع مکان المصحف یسجد فیہ وذکر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یتحری ذلک المکان وکان بین المنبر والقبلۃ ممر الشاۃ۔

یعنی حماد بن مسعدہ یزید بن ابی عبید سے وہ سلمہ بن الاکوع سے روایت کرتے ہیں کہ سلمہ کوشش کرتے تھے مصحف کی جگہ والے مقام کی، اس میں نماز پڑھتے تھے اور انھوں نے ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ کیلئے کوشش فرماتے تھے اور وہ جگہ منبر اور قبلہ کے درمیان بکری کے گذرنے بھر تھی

اس کے بعد وہی بخاری والی حدیث مسلم میں بھی ہے اور مکی بن ابراہیم ہی سے مروی ہے۔ دونوں حدیثوں میں فرق واضح یہ ہے کہ مسلم کی پہلی حدیث میں مسند احمد کی دوسری حدیث کی طرح صرف موضع مکان المصحف کا ذکر ہے۔ اسطوانہ کا ذکر نہیں۔ اور دوسری حدیث میں اس اسطوانہ کا ذکر ہے جو مصحف کے پاس تھا۔ عبارت تقریباً وہی ہے جو بخاری کی حدیث کی ہے اس لئے نقل کی ضرورت نہیں سمجھتا امام نووی صحیح مسلم والی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ لا بأس بلزامۃ الصلوٰۃ فی مکان واحد اذا کان فیہ فضل۔ یعنی اگر کسی جگہ میں کوئی خاص فضیلت ہو تو برابر وہیں پر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر اس جگہ میں اگر کوئی خاص فضیلت نہ ہو تو مسجد میں کوئی جگہ ہمیشہ کے لئے مخصوص کر لینا منع ہے۔ اور بین المنبر والقبلۃ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ قبلہ سے مراد دیوار ہے۔ حافظ ابن حجر بخاری کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

قولہ التی عند المصحف ھذا یدل علی انہ کان للمصحف موضعٌ خاصٌ بہ ووقع عند مسلم بلفظ یصلی وراء الصندوق وکانہ کان للمصحف صندوق یوضع فیہ۔

یعنی بخاری کی حدیث میں جو اس ستون کے بارے میں پتا بتایا ہے جس کے پیچھے سلمہ بن الاکوع نماز پڑھا کرتے تھے کہ وہ ستون مصحف کے پاس تھا۔ یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ (مسجد نبوی میں) مصحف کیلئے کوئی خاص جگہ تھی اور صحیح مسلم میں ایک حدیث اس لفظ سے آئی ہے کہ وہ نماز پڑھتے تھے صندوق کے پیچھے۔ غالباً مصحف کیلئے کوئی صندوق بھی تھا جس میں وہ رکھا جاتا تھا۔

اس ستون کے بارے میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ اسطوانۃ المہاجرین کے نام سے مشہور ہے۔ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ عام طور سے لوگ اس ستون سے واقف نہیں ہیں ورنہ ہر شخص اس کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا اور لوگوں میں کش مکش ہوتی۔ حضرت عائشہؓ نے ابن الزبیرؓ کو چپکے سے اس ستون کو پہچنوا دیا تھا وہ اکثر اسی ستون کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ابن حجرؒ پھر لکھتے ہیں کہ اس ستون کا ذکر ابن النجار نے اپنی کتاب تاریخ المدینہ میں کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ قریشی مہاجرین اس ستون کے پاس مجتمع ہوا کرتے تھے اور ان سے پہلے محمد بن الحسن نے اخبار المدینہ میں بھی اس ستون کا ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری مطبوعہ مطبع انصاری دہلی جلد دوم ص۲۸۷)

امام محی الدین ابوزکریا النواویؒ کے نسخہ صحیح مسلم میں یہ صندوق والی حدیث نہ تھی اس لئے انھوں نے نہ اس صندوق

مصحف کا کوئی ذکر کیا نہ اسطوانۂ مصحف کے بارے میں کوئی خاص تصریح فرمائی۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ اسطوانہ کو مصحف سے کیا تعلق ہو سکتا ہے دیکھئے صحیح مسلم مع شرح النواوی جلد اول ص۱۹۷)

البتہ شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں جو "مکان المصحف" کا لفظ ہے اس کی شرح کرتے ہوئے ابن حجر کی پوری عبارت فتح الباری سے نقل کر دی ہے جس میں وہ عبارت بھی ہے جس میں ابن حجرؒ نے صحیح مسلم کی حدیث میں صندوق مصحف کا ذکر کیا ہے اس کو بھی نقل کر دیا ہے۔ مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ صحیح مسلم میں وہ حدیث کہاں پر ہے یا صحیح مسلم کے کس نسخے میں ہے۔ خود شیخ الاسلام پاکستانؒ کے پاس جو نسخہ ہے جس کی وہ شرح کر رہے ہیں اس میں بھی وہ حدیث نہیں ہے مگر ابن حجر کے پاس جو نسخہ صحیح مسلم کا تھا اس میں وہ صندوق والی حدیث ضرور تھی جبھی تو ابن حجر نے اس کی عبارت کا ایک فقرہ ہی نقل کر دیا۔

فقط ابن حجر ہی نہیں علامہ بدرالدین العینی بھی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں صحیح مسلم کی اس صندوق والی حدیث کا ذکر فرماتے ہیں اور بالکل اسی طرح لکھتے ہیں جس طرح حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔ وہ بھی لکھتے ہیں کانہ کان للمصحف صندوق یوضع فیہ غالباً مصحف کیلئے کوئی صندوق تھا جس میں وہ رکھا جاتا تھا اور اس سے پہلے لکھتے ہیں کان فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موضعٌ خاصٌّ للمصحف۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایک خاص جگہ تھی مصحف کے لئے۔

مگر علامہ بدرالدین عینی نے ایک عجیب و غریب بات اس کے بعد یہ لکھدی جو ان کے سوا کسی نے ان سے پہلے نہیں لکھی تھی کہ الذی کان ثمہ من عہد عثمان۔ اور ایک نسخے میں فی عہد عثمان ہے یعنی مسجد نبوی میں وہ مصحف جو حضرت عثمانؓ کے زمانے سے رہا کرتا تھا یا ان کے زمانے میں رہا کرتا تھا۔

مگر علامہ عینی نے یہاں صرف قیاس سے کام لیا ہے وہ سمجھے کہ حضرت عثمانؓ نے جو متعدد مصاحف نقل کرائے اور ایک ایک مصحف مختلف ملکوں میں بھیج دیئے اور ایک مصحف جو اہل مدینہ کے لئے امام قرار دیکر رکھ لیا تھا وہی مصحف صندوق میں رکھکر مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس رکھدیا ہوگا تاکہ اہل مدینہ اپنے مصاحف کو اس سے ملا ملا کر صحیح کر لیں۔ ورنہ اور کون سا مصحف ایسا ہو سکتا ہے جو اس طرح مسجد نبوی میں رکھا جائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے جمع کرائے ہوئے صحیفے تو ان کے پاس ان کے گھر پر رہے ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ان کے گھر پر رہے ان کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس چلے گئے۔ ان صحیفوں کا مسجد نبوی کے کسی ستون کے پاس ایک صندوق میں ہونا عبید بن ساق نے بیان نہیں کیا ہے تو پھر وہ مصحف اگر ہوگا تو یقیناً حضرت عثمانؓ کے لکھوائے ہوئے مصاحف ہی میں سے ایک مصحف ہوگا مگر یہ علامہ عینی کا محض قیاس ہے جو عبید بن ساق کی اسی غلط اور موضوع روایت پر مبنی ہے جس کا غلط ہونا میں ثابت کر چکا ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ علامہ عینی نے اگر من عہد عثمان لکھا ہے تو من کے بعد الیٰ کا سوال ضرور پیدا ہو رہا ہے۔ یعنی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے سے کبتک وہ مصحف صندوق میں بند مسجد نبوی کے اس ستون کے پاس رہا؟ پھر وہ صندوق اور مصحف کب سے وہاں سے اٹھا لیا گیا اور کیوں اٹھایا گیا اور کہاں گیا؟ ان سوالوں کا جواب علامہ عینی اور ان کے ہمخیالوں کے ذمے ہے اور یہ وہ گتھی ہے جو کبھی سلجھ نہیں سکتی۔

اور اگر فی عہد عثمان لکھا تھا تو یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنۂ شہادت حضرت عثمانؓ کے زمانے میں وہ صندوق اور وہ مصحف اٹھا لیا گیا یا ضائع ہو گیا، کچھ پتا نہ ملا کہ ہو گیا۔ مگر حضرت عثمانؓ کی شہادت ذی الحجہ ۳۵ھ میں ہوئی تھی اور اس وقت غریب یزید بن ابی عبید پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ یزید بن ابی عبید کی وفات ۱۴۷ھ میں ہوئی تھی، یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ایک سو بارہ ۱۱۲ برس کے بعد اور کم سے کم دس بارہ برس کی عمر تو ہونی چاہئے کہ وہ حضرت سلمہ بن الاکوع کے ساتھ مسجد میں آئیں اور ان کو ایک ستون کے پاس کوشش کر کے نماز پڑھتے ہوئے بار بار دیکھیں تو اُن سے اس کوشش کی وجہ پوچھیں۔ اگر یزید بن ابی عبید شہادت حضرت عثمانؓ کے وقت سن شعور کو پہنچ چکے تھے تو اس حساب سے ان کی عمر کم از کم ایک سو چوبیس ۱۲۴ برس کی ہونی چاہئے بلکہ اس سے بھی زیادہ کی کیونکہ اگر حضرت سلمہ بن الاکوع کی نماز کا یہ واقعہ ہوا ہو گا تو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے کچھ پہلے ہی ہوا ہو گا۔ لیکن یزید بن ابی عبید کی عمر سوا سو برس کی بالکل مستبعد ہے۔ کسی کی عمر سو برس بھی ہوتی ہے، ائمہ رجال لکھ دیتے ہیں۔

حضرت سلمہ بن الاکوع کی عمر کے بارے میں خود ابن حجرؒ کو شبہ ہے۔ وہ ان کی عمر کا صحیح اندازہ قائم نہ کر سکے کیونکہ حضرت سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ میں بیعت رضوان میں شریک تھا اور مرنے پر بیعت کی تھی۔ جس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہ اس وقت جوان عاقل و بالغ تھے اس لئے ان کی عمر اس وقت بیس برس کی بھی قرار دیجئے تو بیعت رضوان ۶ھ کا واقعہ ہے اور ان کی وفات ۷۴ھ میں ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت سلمہ کی عمر ۸۸ برس کی تھی۔ یزید بن ابی عبید حضرت سلمہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ حضرت سلمہ کی وفات اور یزید کی وفات کے درمیان ۳۷ برس کا فرق ہے، ہو سکتا ہے کہ حضرت سلمہ کی طرح یزید نے بھی ۸۸ یا ۹۰ برس کی عمر پائی ہو اور یزید نابالغ ہی ہو کہ انھوں نے اس کو آزاد کر دیا ہو، یا نوے سے بھی کچھ اور زیادہ عمر پائی ہو اور حضرت سلمہؓ کے وقت ہی میں بالغ ہو چکا ہو۔ غرض یزید کا حضرت سلمہ کے ساتھ مسجد نبوی میں جانا اور حضرت سلمہ کو بار بار ایک ہی ستون کے سامنے نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا اور یہ پوچھنا کہ آپ خاص کر کے اسی ستون کے پاس کیوں نماز پڑھتے ہیں بعید از قیاس نہیں۔ مگر اس واقعہ کا حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قبل ہونا البتہ بعید از عقل ہے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان والے مصحف کا مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس کسی صندوق میں رہنا بھی بعید از عقل ہے۔ جب تک ان سوالوں کا جواب نہ ملے کہ تو پھر وہ صندوق اور مصحف کیا ہوئے؟ اور کب وہاں سے اٹھا لئے گئے؟ اور کہاں اٹھا کر رکھے گئے؟

اصل یہ ہے کہ "عند" کا لفظ جو ان حدیثوں میں آ گیا ہے عند المصحف کے فقرے میں اس سے لوگوں کو حدیث کے معنی سمجھنے میں بڑا دھوکا ہوا ہے۔ شارحین حدیث یہ سمجھتے ہیں کہ جس وقت حضرت سلمہ یزید بن ابی عبید کے سامنے مسجد کے ایک ستون کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اس وقت اس ستون کے پاس مصحف بھی صندوق میں بند رکھا ہوا موجود تھا۔ جبھی تو عند الاسطوانۃ التی عند المصحف کا مفہوم پورا ہو گا۔ اس لئے انھوں نے سوچا کہ مسجد نبوی کے کسی اسطوانے کے پاس مصحف صندوق میں بند کر کے رکھا گیا ہو گا تو ضرور حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں۔ کیونکہ محدثین کے نزدیک تو حضرت عثمانؓ کے نقل مصاحف سے پہلے مصحف کا وجود ہی نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہڈی، تختی، پتھر کھال، چھال وغیرہ کے منتشر غیر مرتب ٹکڑوں سے کسی طرح زید بن ثابت سے صحیفوں میں قرآن جمع کرایا بھی تھا تو اس کو تو انھوں نے گھر میں مقفل بند رکھا تھا اور تادم وفات کسی کو اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا۔ خدا جانے جمع قرآن جیسا اہم کام کس لئے اور

کس کیلئے انجام دیا تھا کہ بالکل فی کتاب مکنون کا مصداق بنا کر سارے مسلمانوں کی نظروں سے اس کو زندگی بھر پوشیدہ رکھا۔ مطہرون کو بھی اس کے چھونے کی اجازت نہ تھی اور اگر تھی تو کسی روایت میں تو ہوتا کہ اس سے فلاں فلاں صحابہ نے نقلیں لیں، یا اپنے مصاحف کو ملا کر درست کر لیا، یا کبھی اس کی زیارت بھی کی۔ پھر حضرت عمرؓ کو جو حضرت ابوبکرؓ کے بعد اس کتاب یعنی ان صحیفوں کے حفاظت کی خدمت ملی تو انھوں نے بھی اپنے پیش رو کے نقش قدم ہی پر رہ کر ان صحیفوں کو کتاب مکنون ہی بنائے رکھا۔ کبھی کسی کو نہ دکھایا۔ ان کے بعد خدا جانے کیوں یہ صحیفے حضرت عثمانؓ کو نہ ملے بلکہ حضرت حفصہؓ کے پاس چلے گئے۔ انھوں نے بھی اس کو مقفل ہی رکھا۔ بڑی مشکلوں سے حضرت عثمانؓ کو اس کی نقلیں اتارنے کے لئے کچھ دنوں کیلئے دیا تو پھر واپس منگوا لیا تو جن محدثین کا ان باتوں پر ایمان ہو وہ اپنے ایمان کے خلاف کسی طرح یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ حضرت عثمان والے مصاحف کے سوا وہ کوئی اور مصحف ہو سکتا ہے۔ جو مسجد نبوی میں کسی ستون کے پاس ایک صندوق میں بند رکھا گیا ہو۔ چاہے اس کی غرض و علت کا بالکل پتا نہ ملے۔ اگر اس میں کچھ بھی اصلیت ہوتی تو کوئی روایت تو بتاتی کہ ہر شخص اپنے مصحف کو مسجد نبوی میں آ کر اس صندوق میں سے مصحف نکلوا کر اپنے مصحف کی تصحیح اس سے ملا ملا کر کر لیا کرتا تھا پھر یہ کہ اگر لوگ ایسا کرتے تھے تو کس کی نگرانی میں کرتے تھے اور اگر نہیں کرتے تھے تو پھر مسجد میں اس مصحف کے رکھنے کی کیا غرض تھی؟ اس صندوق کا نگراں کون تھا۔ اس کی چابی کس کے پاس رہتی تھی۔ یا وہ یونہی کھلا پڑا رہتا تھا یہ وہ گتھیاں ہیں جنھیں کوئی حل نہیں کر سکتا۔ اگر یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا ہے جس میں اکابر تابعین و صحابہ (حسب ادعائے اصحاب الحدیث) کھلے بندوں روایتیں بیان کرتے اور کر سکتے تھے تو وضع مصحف فی المسجد کا اتنا اہم واقعہ ہزارہا راویانِ حدیث میں سے ایک راوی بھی بیان نہ کرے عقل سلیم اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔

محدثین تو تطبیق احادیث کا فن اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی شرح بھی ہو سکتی ہے خصوصاً اگر دونوں ہم پلہ حدیثیں ہوں۔ صحیح مسلم کی پہلی حدیث میں اسطوانے کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ یتحری موضع مکان المصحف کا جملہ ہے۔ یہ موضع کی اضافت مکان کی طرف اور مکان کی اضافت مصحف کی طرف صاف بتا رہی ہے کہ تحری یعنی حضرت سلمہ کی کوشش اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کی نہ تھی بلکہ مصحف کے رکھنے کا جو مکان جو ٹھکانا تھا اس جگہ تک پہنچنے کی اور اسی جگہ پر نماز پڑھنے کی کوشش تھی، تو یہ کوشش بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مصحف جو اس جگہ پر تھا حضرت سلمہ کے نماز پڑھنے کے وقت موجود نہ رہا ہو۔ اسی قدر نہیں بلکہ یزید بن ابی عبید کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت سلمہ نے فرمایا کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یتحری ذلک المکان

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مکان اسی ٹھکانے تک پہنچنے کی کوشش فرماتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانۂ مبارک ہی میں یہاں سے مصحف منتقل کر دیا گیا تھا اور مصحف رکھنے کی جگہ خالی تھی اسی خالی جگہ پر جہاں پہلے مصحف رہتا تھا رسول اللہ صلعم نفل نمازیں پڑھا کرتے تھے اس لئے الاسطوانۃ التی عند المصحف جو صحیح مسلم کی دوسری حدیث میں یا بخاری وغیرہ میں ہے وہاں عند المصحف سے عند مکان المصحف مراد ہے۔ گویا مسلم کی پہلی حدیث میں جو موضع

مکان المصحف کا فقرہ ہے دوسری حدیثوں میں موضع کے عوض راوی نے عند کا لفظ رکھ دیا اور مکان کا لفظ حذف کر دیا۔ روایتوں میں راوی الفاظ کا ردوبدل بہت کیا کرتے تھے اور عموماً اپنے لفظوں میں مفہوم ادا کرتے تھے۔ اور ایسا حذف تو عربی زبان میں بہت ہوا کرتا ہے بلکہ فارسی و اردو میں بھی مروج ہے۔ جیسے خوختہ ابی بکر یعنی خوختہ بیت ابی بکر۔ دیوار زید یعنی دیوار مکان زید وغیرہ۔ اور اگر عندہی کی سند چاہیے تو لیجئے شاعر جاہلیت عقیل بن علفۃ المری کا شعر حاضر ہے ؎

وکم عند سلمٰی جُدتُ بعد رحیلہا بدمع اعانتہ الدموع السوافک

یہاں عند سلمٰی سے عند منزل سلمٰی ہی مراد ہے ورنہ سلمٰی کی رحلت کے بعد سلمٰی کے پاس شاعر کس طرح کھڑے کھڑے آنسو بہاتا۔ بالکل اسی طرح اس حدیث میں بھی عند المصحف سے مراد عند مکان المصحف ہے اور اس کی کھلی ہوئی دلیل تو خود ہی ابن حجر نے فتح الباری میں لکھدی ہے۔ اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے بعض شارحین مسلم نے بھی شرح مسلم میں نقل کی ہے کہ وہ کون سا ستون تھا؟ جس کے پاس رسول اللہ صلعم برابر نفل نمازیں اپنی مسجد میں پڑھا کرتے تھے اس کو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ جانتی تھیں مگر لوگوں کے اژدحام اور کشاکش کے خیال سے کسی کو بتاتی نہ تھیں۔ صرف اپنی بہن کے بیٹے عبداللہ بن الزبیرؓ کو انھوں نے بتادیا تھا، اس لئے وہ اس ستون کے پاس برابر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مکان المصحف ایک مدت سے مصحف سے خالی تھا یہانتک کہ عام صحابہ کو خصوصاً جن کو جنگ احد وغیرہ کے بعد ایمان لانے کا موقع ملا وہ اس سے مطلق واقف نہ تھے کہ مسجد نبوی میں کبھی کسی ستون کے پاس ایک صندوق میں مصحف بھی رہتا تھا یا نہیں۔ اگر آپ کسی خاص ستون کے پاس نفل نمازیں پڑھتے بھی تھے تو اس کو کسی نے چنداں خیال نہ کیا اور سلمہ بن الاکوع کی طرح جس نے خیال کیا اس نے بغرض اتباع سنت اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کا خیال رکھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم کے صلا جلد ثانی کی سطر اول میں یہ تحریر کیا ہے کہ

وتحریہ ذلک لصلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ، لا لکون المصحف

یعنی حضرت سلمہ کی کوشش کہ اسی ستون کے پاس نماز پڑھیں اس لئے تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے، نہ اس لئے کہ وہاں مصحف تھا۔

لیکن حضرت مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کیوں اس ستون کے پاس برابر نفل نمازیں پڑھنے کی تحری و کوشش فرماتے تھے؟ جب کہ آپ خود لوگوں کو منع فرماتے تھے کہ مسجد میں اپنے لئے کوئی خاص جگہ نماز پڑھنے کی معین نہ کرلو۔ اصل یہ ہے کہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحری و کوشش کے وقت اس ستون کے پاس مصحف تھا نہ سلمہ بن الاکوعؓ کی تحری و کوشش کے وقت وہاں کوئی مصحف تھا۔ جب وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صندوق مصحف اٹھوادیا اور وہ جگہ خالی ہوگئی تو مسجد کی اور جگہوں میں سے اس جگہ کو کچھ دنوں تک وہاں پر مصحف کے رکھے جانے کی وجہ سے ببرکتِ مصاحبتِ قرآن مجید ایک خاص خصوصیت حاصل ہوگئی تھی اس لئے جہاں پر وہ مصحف رہتا تھا وہاں رسول اللہ صلعم نفل نمازیں پڑھنے لگے۔ اور سلمہ بن الاکوع رسول اللہ صلعم کی اس تحری و کوشش کو دیکھکر خود بھی اسی جگہ پر نفل نمازیں پڑھنے کی تحری و کوشش کرنے لگے۔ خود تمام شارحین حدیث اس موقع پر لکھتے ہیں کہ

لا باس بادامۃ الصلوٰۃ فی موضع واحد اذا کان فیہ فضل۔ واما النھی عن ایطان الرجل موضعا من المسجد یلازمہ فھو فیما لا فضل لہ ولا حاجۃ الیہ۔

یعنی کوئی مضائقہ نہیں ہے (مسجد میں) کسی ایک خاص جگہ برابر نماز پڑھنے میں اگر اس جگہ کو کوئی خاص فضیلت ہو اور ممانعت جو ہے مسجد میں کسی جگہ کو اپنے لئے مخصوص کر لینے کی جس کی ملازمت کی جائے وہ ایسی جگہ کے بارے میں ہے جس میں کوئی فضیلت نہ ہو یا کوئی حاجت کوئی ضرورت اس کی نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس جگہ میں کوئی خصوصیت ضرور تھی ورنہ حضورؐ اپنی نوافل کے لئے اس جگہ کو مخصوص نہ فرماتے۔ اس کے بعد وجہ خصوصیت کا سوال سامنے آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی مسجد کی اس جگہ کو اس لئے اپنے لئے مخصوص فرمالیا تھا کہ وہاں پہلے مصحف رہتا تھا تو اس ستون کے پاس جو جگہ رسول اللہ صلعم کے نماز پڑھنے کی تھی اس جگہ میں فضیلت مصحف ہی کی وجہ سے آئی تھی۔ وہ جگہ ایک ایک ستون کے پاس تھی اور وہ ستون موجود تھا مگر مصحف موجود نہ تھا اسی لئے متعدد حدیثوں میں عند الاسطوانہ کا لفظ آیا ہے یعنی حضرت اس ستون کے پاس نماز پڑھتے تھے جو مقام مصحف کے پاس تھا یعنی اس جگہ کے پاس تھا جہاں مصحف رکھا جاتا تھا کسی زمانے میں بھی۔ اگر کسی کو میری اس توجیہ سے انکار ہے تو وہ اس جگہ کی کوئی دوسری وجہ خصوصیت و فضیلت ثابت کر کے دکھا دے۔

ابن حجر اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس ستون اور مصحف وغیرہ کا ذکر ابن النجار نے تاریخ مدینہ میں بھی کیا ہے۔ اور ان سے پہلے محمد بن الحسن اخبار مدینہ میں اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ تمنا غفرلہ عرض کرتا ہے کہ تاریخ ابن النجار اورینٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اپنی کتاب کے زمانہ آغاز تحریر میں میں نے دیکھی تھی اس کی عبارت بھی نوٹ کر لی تھی اور پہلے مسودے کے حاشیے پر لکھ لی تھی مگر وہ مسودہ تقریباً ۱۳۴۰ھ کا لکھا ہوا تھا اور نوٹ کر کے لایا تھا پنسل سے کتاب پر کیس کی روشنائی سے لکھا تھا حروف کاغذ کو کھا گئے اور خود بھی مٹ گئے نہ کتاب کا نمبر پڑھا جاتا ہے نہ صفحے کی گنتی نہ عبارت ہی پوری طرح پڑھی جاتی ہے اسلئے یہاں ڈھاکہ میں بیٹھکر اس کی عبارت پیش کرنا محال ہے اور صرف اس کام کے لئے پٹنہ (انڈیا) جانا قریب بمحال۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں اس ستون کو صحابہؓ "اسطوانۃ المصحف" کہا کرتے تھے۔ جب مصحف وہاں سے ہٹا دیا گیا تو مہاجرین درس قرآن کے لئے اکثر اسی جگہ آکر بیٹھتے تھے اور آپس میں قرآن کا دور کرتے تھے اس لئے وہ بعد کو "اسطوانۃ المہاجرین" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کی تائید میں اتنا تو ابن حجر وغیرہ بھی لکھتے ہیں کہ اس ستون کو اسطوانۃ المہاجرین کہتے ہیں۔

حدیثوں کے سیاق عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مصحف کا صندوق جہاں پر رہتا تھا وہ اتنی ہی مختصر سی جگہ تھی کہ ایک بکری وہاں پر سے باطمینان گذر جا سکتی تھی اس لئے ایک آدمی کے نماز پڑھنے کی جگہ بھی وہاں پر ضرور ہو سکتی ہے مصحف جس صندوق میں تھا وہ کوئی صندوقچہ مختصر سا بکس ہی ہوگا، کوئی بڑا صندوق تو ہوگا نہیں۔ رسول اللہ صلعم کی حیات مبارک میں اور ابتدائے زمانہ ہجرت میں صحابہؓ خصوصاً انصار کی تعلیم کے لئے اور ان کو قرآن کی نقلیں حاصل کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ جتنی سورتیں تقریباً تیرہ برس مکہ معظمہ میں اترتی رہیں جن کی تعداد ۸۶ ہے وہ لوگ بھی اپنے پاس لکھ لکھا کر رکھ لیں اور یہ کام جبھی ہو سکتا تھا کہ مسجد نبوی میں مصحف نبوی جس میں آپ

کاتبین وحی سے ہر نازل شدہ آیت و سورہ لکھوایا کرتے تھے۔ محفوظ طریقے سے رہے۔ اور خود رسول اللہ صلعم کی نظروں کے سامنے آپ کی نگرانی میں صحابہؓ خصوصاً انصارؓ اس مصحف سے رفتہ رفتہ تمام مکی سورتیں نقل کرلیں تاکہ ہر صحابی کے پاس قرآن موجود رہے۔ میں نے زید بن ثابت انصاری کی حدیث اپنی کتاب کے صہ ۶۹ میں نقل کی ہے کہ زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ

کنا عند رسول اللہ صلعم نؤلف القرآن من الرقاع - (مستدرک و فتح الباری و اتقان ...)

یعنی ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس بیٹھکر رقعوں سے یعنی اوراق سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

یہ حدیث صاف بتارہی ہے کہ صحابہؓ خصوصاً انصارؓ رسول اللہ صلعم کے سامنے آپ کی نگرانی میں قرآن کے اوراق سے نقل کرکے خود قرآن جمع کرتے تھے یہاں تک کہ بعض عورتوں نے بھی قرآن جمع کرلیا تھا جیسے حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث الشہیدہ رضی اللہ عنہا (سنن کبری بیہقی ج ۳ ص ۱۳۰)

غرض جن اوراق سے انصار قرآن جمع کرتے تھے وہ اوراق اسی مصحف نبوی کے تھے ورنہ اور کس چیز کے اوراق تھے؟ اور جہاں صحابہ بیٹھکر آنحضرت صلعم کے سامنے نقل کرتے تھے وہ مسجد نبوی کے سوا اور کونسی جگہ ہوسکتی ہے؟ جب تمام مکی سورتوں کو انصار نے نقل کرلیا تو پھر مدنی سورتوں کے لئے تو انصار و مہاجرین سب برابر تھے۔ جیسے جیسے سورتیں اور آیتیں اترتی جاتی تھیں خود آنحضرت صلعم بھی اپنے مصحف میں حضرت حفصہ کے یہاں سے منگواکر پہلے لکھوا لیتے تھے اور پھر ہر صحابی اس کو مصحف نبوی سے اپنے مصحف میں نقل کرلیتا تھا۔ اب اس کو مسجد میں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ منافقین کی دراندازیوں کا خطرہ ہو یا نہ ہو مکی سورتوں کی نقلیں جب انصار کے پاس مہیا ہوگئیں تو پھر صندوق مصحف کے مسجد میں رکھنے کی ضرورت نہ رہی اور آنحضرت صلعم نے اس مصحف کو غالباً مع صندوق مسجد سے اٹھواکر حضرت حفصہ کے حجرے میں رکھوا دیا اور وہی مصحف عہد نبوی کے حضرت حفصہؓ کے پاس ان کے آخیر وقت تک رہا۔ کیسا صحیح تسلسل واقعات ہے جس کو ہر عقل سلیم تسلیم کرسکتی ہے اگر انصاف سے کام لے۔ مگر خلاف عقل و بعید از قیاس باتوں پر اصرار اور مطابق عقل و موافق قیاس بات سے انکار کی عادت جن لوگوں کو ہو ان سے ہٹنا بہت مشکل ہے ؎

بحث میں مولوی نہ ہاریں گے   جان ہاریں گے، جی نہ ہاریں گے

ع ۵ یعنی آخر میں مسجد نبوی سے اٹھکر وہ مصحف حضرت حفصہؓ کے پاس چلا گیا۔ اس پر میں اپنی کتاب میں بھی بقدر ضرورت بحث کرچکا ہوں اور اس مضمون کے بھی اوپر کے نمبروں میں اسپر کسی قدر روشنی ڈال چکا ہوں اسلئے اس پر مزید خامہ فرسائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ محض احتیاطاً چند خصوصیتیں حضرت ام المومنین حفصہؓ کی یہاں لکھتا ہوں جن کی وجہ سے امانت مصحف کیلئے ان کا انتخاب بہتر انتخاب تھا۔

(ا) وہ دوسری ازواج مطہرات میں زیادہ لکھی پڑھی تھیں۔

(ب) حضرت عائشہؓ کمسن تھیں اور حضرت حفصہ ان سے زیادہ سن رسیدہ تجربہ کار تھیں۔

(ج) ان کے پاس مصحف کے رہنے سے اس کی نگرانی صرف وہی تنہا کرنے والی نہ تھیں بلکہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عاصم بن عمرؓ بھی اس کی نگرانی کے ذمہ دار تھے۔ اور رہے۔

(د) حضرت حفصہؓ کے سوا اگر کوئی اور اس مصحف کی امانت و حفاظت کا ذمہ دار ہوسکتا تھا تو وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں مگر اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ بات تھی کہ دور فتن میں حضرت صدیقہؓ کو بھی کسی قدر مبتلا ہونا پڑے گا اور حضرت حفصہؓ باوجود زمانہ فتن میں رہنے کے اپنے کو

ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھ سکیں گی۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے دل میں حضرت حفصہؓ کا انتخاب امانتِ مصحف کیلئے ڈالا اور حضرت عائشہؓ کا انتخاب آپ نے نہیں فرمایا

(۷) اس مصحف نبوی کی اب کسی کو بھی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی، ہر شخص کے پاس مصحف کا صحیح نسخہ مصحف نبوی سے ملا یا ہوا موجود ہی تھا، اور نئے لکھنے والے انھیں ملائے ہوئے صحیح نسخوں سے ان کے مطابق نئے نئے مصاحف کے نسخے لکھنے میں برابر مصروف تھے تو اب مصحف نبوی کو کسی ایسے ہی محفوظ جگہ رکھنے کی ضرورت تھی جہاں کسی کی دسترس نہ ہو اور جابر و سخت مردوں کی نگرانی بھی ساتھ ساتھ رہے۔

غرض حضرت حفصہ کے پاس صحیفوں کا ہونا جب ہر فریق کے نزدیک مسلّم ہے تو ان کے پاس جو صحیفے یا مصحف تھے میرے نزدیک تو حسب دلائل بالا و تصریحات سابقہ وہ مصحف نبوی ہی تھا جو اوائل زمانہ ہجرت میں کچھ دنوں مسجد نبوی میں ایک ستون کے پاس صندوق میں رہا کیا پھر حسب مقتضیاتِ مصرحہ مسجد نبوی سے اٹھوا کر اس کو رسول اللہ صلعم نے حضرت حفصہؓ کے پاس بھجوا دیا تھا۔

مگر جو لوگ میرے دعوے اور میرے دلائل کو نہیں مانتے ہیں وہ اسکی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا جمع کیا ہوا قرآن حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تھا تو صحیح طور سے پہنچا تھا مگر حضرت عمرؓ کے بعد وہ صحیفے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں چلے گئے؟ لے دے کر بعض لوگوں نے یہ وجہ لکھی ہے کہ حضرت حفصہؓ حضرت فاروقؓ کی وصیہ تھیں۔ اسلئے وہ مصحف حضرت عمرؓ کے بعد حضرت حفصہ کے پاس بھیجدیا گیا۔ اول تو یہ وجہ صحاح کی کسی کتاب میں مذکور نہیں اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کی وہ وصیہ تھیں تو حضرت عمرؓ کے ذاتی مال اور ان کی ذاتی باتوں کے متعلق یا امور خلافت اور بیت المال کی چیزوں کے متعلق؟ حضرت فاروقِ اعظمؓ سے یہ ناممکن ہے کہ وہ بلا استمزاجِ صحابہ و بلا استصوابِ اکابر مہاجرین و انصار ایک ایسی چیز جو بیت المال کی سب سے اہم چیز ہو اس کو بطور خود بلا وجہ اور بے ضرورت بیت المال سے نکال کر حضرت حفصہؓ کے پاس خود بھیجدیں یا دوسروں کو کہدیں کہ میرے بعد یہ چیز حضرت حفصہ کے پاس بھیجدی جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ سے کبھی ایسے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی جس کام کے کرنے کا ان کو کوئی حق نہ دینی حیثیت سے تھا اور نہ دنیاوی حیثیت سے۔

اتنی لمبی تحریر میں توفیقہ تعالیٰ سائلین کی تمام باتوں کا تشفی بخش جواب میں دے چکا ہوں۔ اب تشفی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ حضرات سائلین۔ اتنی طویل گذارش سے مطمئن ہو جائیں گے اور طوالت تحریر کو معاف فرمائیں گے۔ والسلام خیر الختام

تمنا عمادی غفرلہ

استدراک

ہم اس مضمون کو محض اسلئے شائع کر رہے ہیں کہ علامہ تمنا صاحبؒ سے استوائے مصحف کے متعلق حوالہ پوچھا گیا جس کا جواب ان کے ذمہ لازم آ گیا ورنہ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے اس بحث میں یہ نکتہ کو نسا ایسا اہم تھا جسے اس طرح نمایاں کیا جاتا لیکن منکرین قرآن کا یہ خاصہ ہے کہ ان کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کوئی علمی دلیل تو ہوتی نہیں اسلئے وہ عوام کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ صاحب کے اس جواب سے طالبینِ حق کی تو تسلی ہو جائیگی لیکن جہانتک منکرین قرآن کا تعلق ہے انھیں تو اگر خود اللہ میاں بھی آ کر کہدیں کہ ہم نے اپنی کتاب کی خود حفاظت کی ہے تو وہ اس پر بھی سر ہلا دینگے کہ نہیں ایسا تسلیم کرنے سے ہمارے اسلاف پر حرف آتا ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود منکرین قرآن برابر پکارے جا رہے ہیں کہ نہیں رسول اللہ صلعم نے قرآن غیر محفوظ شکل میں چھوڑا تھا اور اس میں کم از کم حجاج بن یوسف کے زمانہ تک ردوبدل ہوتا رہا ہے یہ وہ لوگ جو دین متین کے حامی اور شرع مبین کے عالم کہلانے کے مدعی ہیں۔

(طلوع اسلام)

خطبہ تقسیم اسناد

[قارئین طلوعِ اسلام ہز ایکسلنسی ڈاکٹر عزام بے سفیر مصر متعینہ پاکستان سے متعارف ہیں۔ نو واردانِ بزم طلوعِ اسلام کو شاید اس سے تعجب ہو کہ ہم نے یہ کیوں لکھا کہ طلوعِ اسلام کے پڑھنے والے ہز ایکسلنسی سے متعارف ہیں اسلئے کہ سفیر مصر متعینہ پاکستان سے بھلا کون ناواقف ہے؟ لیکن ہم سفیر مصر متعینہ پاکستان کا تعارف نہیں کرا رہے بلکہ ان عزام بے صاحب کا تعارف کرا رہے ہیں جن سے اس طلوعِ اسلام کے قارئین کو قلبی تعلق ہے جو علامہ اقبال کی یاد میں شائع ہوتا ہے یعنی وہ عزام بے صاحب جنھیں اقبال سے عشق ہے اور جنھوں نے کلامِ اقبال کو عربی میں منتقل کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے۔ کتنا حسین ہے یہ نصب العین اور کیسی مبارک ہے یہ کوشش۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ کراچی کے ہنگامہ خیز شہر میں جہاں لوگوں کی گوناگوں مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ "کسے را بکسے کارے نباشد" اس شہر کے شور و شر سے دور، مملکتِ مصر کے سفارت خانہ کے ایک گوشہ میں ہفتہ میں ایک دو بار قلندرانِ اقبال کی ایک مختصر سی محفل کیف بار ہوتی ہے جس میں اقبال کی کوئی ایک کتاب مسلسل سامنے رکھی جاتی ہے۔ پیامِ اقبال کے اسرار و غوامض، قرآن کریم اور علوم جدیدہ کی روشنی میں زیر بحث آتے ہیں اس کے بعد محترم علامہ عزام بے اس حصہ کا عربی میں منظوم ترجمہ کرتے ہیں اور اس طرح یہ کاروانِ شوق [illegible] آہستہ آہستہ خاموشی سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ "پیامِ مشرق" اور "ضرب کلیم" کا عربی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ "اسرار و رموز" اور "ارمغانِ حجاز" کا اردو حصہ ختم کئے جا چکے ہیں اور اب "بالِ جبریل" شمعِ محفل بن رہی ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محترم پرویز صاحب اور ڈاکٹر عزام بے جناب کی مساعی میں برکت عطا فرمائے جن کی بدولت اقبال اور قرآن کا پیغام ممالک اسلامیہ کے عربی بولنے والے مسلمانوں کی نگاہوں تک پہنچ رہا ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی دعوت پر ڈاکٹر عزام بے صاحب نے ۱۷ دسمبر ۱۹۵۲ء کو خطبہ تقسیم اسناد ارشاد فرمایا اس خطبہ کا اردو ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے محترم عزام بے صاحب کی خدمت میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کر کے اپنی جوہر شناسی اور حسنِ انتخاب کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ طلوعِ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔ طلوعِ اسلام]

خطبۂ تقسیم اسناد یہ امر میرے لئے موجب بہجت و مسرت ہے کہ میں آج ڈھاکہ یونیورسٹی کے گریجویٹ طلباء کو مخاطب کر رہا ہوں۔ میں اس تقریب پر ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرف سے دعوت کو اپنے لئے باعث فخر ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس میں اپنی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل بھی دیکھتا ہوں۔ چند سال ہوئے ڈھاکہ یونیورسٹی نے قاہرہ یونیورسٹی کو لکھا تھا کہ انھیں شعبۂ ثقافت اسلامیہ کے لئے پروفیسر کی ضرورت ہے۔ میں اس زمانہ میں قاہرہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ آپ کی یونیورسٹی کی طلب میرے لئے بڑی خوش آئند تھی چنانچہ

میں نے اس مقصد کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں لیکن چونکہ خود قاہرہ یونیورسٹی میں اساتذہ کی کمی تھی، انھوں نے مجھے اپنے منصب سے سبکدوش نہ کیا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کو اس وقت دیکھوں جب یہ پاکستان کی تشکیل کے بعد ایک آزاد یونیورسٹی بن چکی ہو۔ اس پاکستان کی تشکیل کے بعد جو ایک عظیم مملکت اور عظیم ملت ہے۔ اور جس کے ساتھ تمام مسلمانانِ عالم کی خوشگوار امیدیں وابستہ ہیں۔

عزیزانِ من! تم ایک نئی زندگی کی پہنائیوں کو زیر پر لانے والے ہو ـــ عمل کی زندگی، جدوجہد کی زندگی، سعی و کاوش کی زندگی ـــ مجھے یقین ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ تم اس نئی زندگی کی تجربہ گاہ میں قدم رکھنے والے ہو ایسے لوگوں سے چند کلمات نصیحت جو تم سے پہلے اس دشت کی سیاحی کر چکے ہیں، تمہارے لئے ناخوشگوار نہیں ہوں گے۔ میں چونکہ خود پروفیسر رہ چکا ہوں اس لئے مجھے خوش قسمتی سے یونیورسٹی کے طلبار سے خلاملا کا کافی موقع ملا ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ یونیورسٹی کے نوجوان طالب علموں کی آرزوئیں کیا ہوتی ہیں اور انھیں اس سفرِ زندگی میں کس ساز و یراغ کی ضرورت ہے جس میں انھیں ان دشواریوں اور ذمہ داریوں سے دوچار ہونا اور ان ٹھوس حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو عصرِ حاضر کے تقاضوں نے ان کے لئے قدم قدم پر پیدا کر رکھے ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے ان مراحل کا بھی غائر نگاہ سے مطالعہ کیا ہے جن سے خود میرا ملک اور دنیا کے کئی دیگر ممالک بالخصوص ممالک اسلامیہ اپنے سیاسی، عمرانی، اور اخلاقی مقاصد کو ساتھ لئے ہوئے گذرتے چلے آئے ہیں۔ اس اعتبار سے مجھے امید ہے کہ میرا مشورہ محض نظری نہیں ہو گا بلکہ عملی اور قابلِ اعتماد ہو گا۔

ہم سب آزادی کی طویل المیعاد جنگ سے گذرے ہیں اور اب حصولِ آزادی کے بعد ایک درخشندہ و تابندہ مستقبل کی تعمیر میں مصروفِ کار ہیں لہٰذا اب ہماری ذمہ داریاں پہلے سے بھی زیادہ ہیں بالخصوص اہلِ پاکستان کی ذمہ داریاں اسلئے کہ ملتِ پاکستانیہ نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو اسلامی اصول و روایات کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر استوار کریگی۔ اس ملت کی طرف تمام اسلامی اقوام بلکہ تمام اقوامِ عالم نظریں جمائے بیٹھی ہیں کہ دیکھیں یہ قوم اپنے نصب العین تک کس طرح پہنچتی ہے اور نوعِ انسانی کی خوش بختی اور مرفہ الحالی کے پروگرام میں کس انداز سے شریک ہوتی ہے۔

ہم میں سے جن اقوام نے بعد از سعی بسیار آزادی حاصل کر لی ہے اور اس طرح تمام مشکلات پر قابو پا کر اس قابل ہو گئے ہیں کہ ہم اپنے گھر کا نقشہ اپنے تصورات کے مطابق خود اپنے ہاتھ سے مرتب کر سکیں۔ ہمارے سامنے اب ایک بڑی مہم اور پہلے سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک چھوٹی مشکل کو حل کر کے بڑی مشکل کے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے متعلق روایت ہے کہ جب آپ کسی جنگ کے بعد مدینہ واپس تشریف لاتے تو فرمایا کرتے کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اس جہادِ اکبر سے مراد تھی افرادِ ملت کی ایسی تعلیم و تربیت کہ جس سے وہ ایک صالح معاشرہ کے اجزاء بن سکیں۔

مجھے اس حقیقت کا احساس ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمان طالب علم ہماری قدیم تہذیب و روایات اور عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن کے

دوراہے پر پریشان کھڑا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس کے سامنے ان دونوں تہذیبوں کو متمیز شکل میں رکھدیں تو ہم اسے اس پریشانی فکر و نظر سے بچا سکتے ہیں جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے اور جس کی وجہ سے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں ان میں سے کسے اختیار کروں اور کسے چھوڑوں۔ یا ان میں کس طرح تطبیق کی شکل پیدا کر دی۔ میرے نزدیک ایک تہذیب وہ ہے جسے ہم صنعتی تہذیب کہہ سکتے ہیں اور جو علوم سائنس اور قوانین فطرت پر مبنی ہے۔ یہ تہذیب نہ کسی خاص قوم اور مذہب سے وابستہ ہے اور نہ کسی خاص ملک اور وطن سے متعلق۔ اسلئے ہمیں اس تہذیب کے ماحصل اور ثمرات سے متمتع ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً اسلامی انجنیری اور یورپین انجنیری یا اسلامک کیمسٹری اور یورپین کیمسٹری میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ دوسری تہذیب وہ ہے جسے ہم تہذیب انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ تہذیب، مذہب، تاریخ، روایات، اور مختلف طرق و اسالیب حیات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تہذیب ہر قوم کی اپنی اپنی ہوگی اس لئے ہم کسی دوسری قوم کی تہذیب کو اپنے ہاں رائج نہیں کر سکتے۔ اسلامی تہذیب دنیا کی تہاذیب میں بہت بلند ہے اور ہمارے لئے باعث فخر و مباہات اور وجہ سرفرازی و سربلندی۔ اس لئے ہمیں اس تہذیب پر قائم رہنے اور اسے اپنی زندگی کا منہاج اور مسلک بنانے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر آپ مذکورہ صدر دونوں تہذیبوں کے ان امتیازی خطوط کو سامنے رکھیں گے تو آپ کے دل میں وہ الجھن پیدا نہیں ہوگی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

علم کا حصول ہماری بنیادی روایات میں سے ہے۔ ہم صدیوں تک اقوام عالم کیلئے علم و دانش کے مشعل بردار رہے ہیں۔ قرآن اور کتب احادیث و تاریخ میں حصول علم کی تاکید کے لئے بہت سے احکام اور اقوال موجود ہیں۔ کتاب اللہ کی سب سے پہلی نازل شدہ سورت کا افتتاح "اقرأ" کے لفظ سے ہوتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں ہے:-

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللہ من شئ

کیا یہ ملکوت ارض و سما اور ہر اس شے میں جو خدا نے پیدا کی ہے غور نہیں کرتے۔

قرآن نے رسول اللہ کو تاکیداً کہا کہ وہ رب زدنی علماً کی دعا مانگا کریں اور رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ تحصیل علم گہوارہ سے لحد تک برابر کرتے رہنا چاہئے۔ ایک بزرگ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ کیا بوڑھے آدمی کیلئے بھی علم کا حاصل کرنا اچھا ہے؟ اس نے کہا کہ جب تک اس کیلئے زندہ رہنا اچھا ہے علم حاصل کرنا بھی اچھا ہے۔ تم نے مسلم حکیم البیرونی کا نام سنا ہوگا۔ جب وہ بستر مرگ پر تھا تو اس کا ایک دوست عیادت کیلئے آیا۔ البیرونی نے اس وقت بھی اس سے ایک سوال پوچھا۔ اس کے دوست نے کہا کہ تم بستر مرگ پر ہو، اب سوالات کرنے اور ان کا جواب دینے کی کیا ضرورت ہے؟ البیرونی نے کہا کہ جس چیز کے متعلق میں نے سوال کیا ہے اس کی بابت علم حاصل کر کے مرنا اس سے بہتر ہے کہ اس سے لاعلمی کی حالت میں موت آجائے۔ ان مثالوں سے اندازہ لگائیے کہ مسلمانوں کے ہاں حصول علم کا کس قدر شوق رہا ہے۔

حصول علم کے ساتھ ہی اسلامی تعلیم اور مسلمانوں کی تاریخ اس پر شاہد ہیں کہ اسلام نے عمل پیہم پر کسقدر زور دیا ہے اور زمانہ سلف کے مسلمان اسے کس طرح اپنی زندگی کا معمول بنائے ہوئے تھے۔ ہم کبھی اس علم کے قائل نہیں رہے جس کا اظہار ہمارے عمل سے نہ ہوتا ہو۔ ہم

اپنے کسی عالم کی عزت نہیں کرتے تھے جب تک وہ عامل نہیں ہوتا تھا۔ یہ حقیقت اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کی تائید و شہادت میں قرآنی آیات یا روایات و اقوال کا پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک تندرست و توانا جسم کے اندر قلب صالح کی تعمیر کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کیلئے صالح سیرت کی تعمیر ناگزیر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نصب العین بہت بلند ہے لیکن ہمارے دور کی تعلیمی مشینری صالح سیرت تعمیر کرنے کے بجائے صرف معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ یعنی اس کا مقصد اتنا ہی ہے کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اسے طالب علم کے ذہن میں منتقل کر دیا جائے۔ حالانکہ تعلیم کا واضح اور متعین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے طالب علم اس قابل ہو جائے کہ اپنی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور متوازن انداز سے بسر کر سکے لہٰذا تعلیم کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ وہ انسان کی عملی زندگی کی تجربہ گاہ میں پوری اترے اور اس سے انسان اس قابل ہو جائے کہ وہ نوع انسانی کی بہبود اور منفعت کے کاموں میں عملاً حصہ لے سکے۔ اس باب میں وہائٹ ہیڈ (White Head) اپنی کتاب (The aims of education) میں لکھتا ہے کہ

> میں مدت العمر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تعلیم کا صرف ایک ہی موضوع ہونا چاہئے یعنی ـــــ زندگی اپنے تمام مظاہر کے ساتھ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تعلیم معلومات کے مجموعہ کا نام نہیں۔ وہائٹ ہیڈ کے الفاظ میں "تعلیم اس ہنر کا نام ہے جس سے انسان کو علم کا استعمال آجاتا ہے"۔

ہم ملتِ اسلامیہ کے افراد ہیں۔ میں اس وقت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے صرف ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی فرد یا جماعت کیلئے مرفہ الحالی اور خوشگواری کی زندگی بسر کرنے کا راز وحدت کے اندر ہے۔ وحدتِ خالق، وحدتِ نفسِ انسانی، عائلی زندگی کی وحدت وحدتِ ملت اور آخر الامر وحدتِ انسانیت۔ اسلام خدا کی وحدت کی تعلیم دیتا ہے اس سے نفسِ انسانی کو امن و سلامتی نصیب ہو جاتی ہے اور اس کے فکر و عمل میں حق و صداقت کی راہ سے ہٹے بغیر یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے تمام امت کے لئے ایک ہی راہ اور ایک ہی منزل متعین ہو جاتی ہے۔ ایک فرد کیلئے تعلیم و تربیت اعلیٰ کی کلید یہی ہے۔ جب کسی قوم کی تشکیل ان خطوط پر ہو جائے تو وہ ہر ممکن کام کی اہل ہو جاتی ہے اور ہر قسم کا علم حاصل کر سکتی ہے اور اس سے بڑے بڑے عظیم الشان کارنامے سرزد ہو سکتے ہیں۔

عزیزانِ ملت! میری نصیحت یہ ہے کہ آپ اپنی ملت کیلئے وجہ افتخار بنئے اور اپنے آپ کو اپنی درخشندہ روایات اور اپنی ملت کی گرانبہا وراثت کا اہل ثابت کیجئے۔ مستقبل کو امید اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھئے۔ سفرِ زندگی میں مردانہ وار چلئے اور راستہ میں جو مشکل آئے اس کا خنداں پیشانی سے استقبال اور ثبات و ہمت سے مقابلہ کیجئے۔ اپنی تنظیم کیجئے۔ اپنے گھروں کی تنظیم کیجئے۔ اپنی جماعتوں میں وحدت پیدا کیجئے اور اپنی ملت میں وحدت پیدا کیجئے اور اس طرح وحدتِ قلب و نگاہ اور یگانگتِ فکر و عمل سے اپنے تابناک مستقبل کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے حق و صداقت کی راہ پر مردانہ وار آگے بڑھتے چلے جائیے۔ خود اعتمادی اور جگرداری کے ساتھ اس انداز سے جو تمہارے حال اور ماضی کے شایانِ شان ہو۔ اسلئے کہ

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔

تم بہترین قوم ہو جو نوع انسانی کے فائدہ کیلئے پیدا کی گئی ہے تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم دنیا میں معروف کا حکم کرو اور لوگوں کو منکر سے روکو، اور اللہ پر ایمان رکھو۔

اور سفر زندگی میں

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

نہ ہمت خوردہ ہو نہ غمگین اس لئے کہ اگر تم مومن رہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔

جہانتک عائلی زندگی کی وحدت کا تعلق ہے قرآن والدین کی اطاعت اور انکی تعظیم کی اسی طرح تلقین کرتا ہے جس طرح خدا کی توحید اور اطاعت کا حکم دیتا ہے[1]۔

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین احسانا۔

اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین سے احسان کرو۔

دوسری جگہ ہے:۔ ان اشکرلی ولوالدیک

میرے اور اپنے والدین کے شکرگذار رہو۔

ایک قوم کی تعمیر میں عائلی زندگی کو بڑا دخل ہے۔ اسی سے افراد کی سیرت، اصول اور جذبات میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ عائلی زندگی کی تطہیر اور وحدت ہی سے قومی زندگی میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے عائلی زندگی نظم ملت میں مصرعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی مصرعہ کا وزن درست نہ ہو یا مختلف مصرعوں میں توافق اور تعدیل نہ ہو تو اس نظم کو نہ درست کہا جا سکتا ہے نہ حسین۔

جہانتک ملت کا تعلق ہے اس کی کامیابی اور کامرانی کا سنگ بنیاد وحدت ہے بلکہ اب تو یہ ہے کہ اس کی ہستی کا وجود ہی وحدت پر منحصر ہے۔ قرآن کی متعدد آیات وحدتِ ملت کی تائید کرتی ہیں۔ بالخصوص یہ آیت

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا

تم سب ضابطۂ خداوندی کو مضبوط ہاتھوں سے تھامے رکھو اور الگ الگ راستے اختیار نہ کرو، اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ سو اس نے تمہارے قلوب میں ائتلاف پیدا کر دیا اور اپنی نوازشات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

---

[1] ہماری بصیرت کے مطابق قرآن والدین کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا ان سے نیک سلوک اور نرمی کے برتاؤ کا حکم دیتا ہے۔ اس موضوع پر ہم طلوع اسلام میں اس سے قبل تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

اسوقت طلوع اسلام کے پڑھنے والے

ایک دوسرے سے واقف نہیں۔ حالانکہ ان کی حیثیت صرف ایک رسالہ کے خریدار کی نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ فکر و نظر کی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک تحریک کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ ہمیں کئی حضرات نے لکھا ہے کہ انھیں ان کے شہر کے قارئین سے متعارف کرا دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں اور مل بیٹھکر مختلف مسائل پر سوچ بچار کر سکا کریں۔ یہ تجویز اچھی ہے۔ ہم فکر لوگوں کا ایک دوسرے سے متعارف ہونا ضروری ہے اس کی عملی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ جو صاحب سمجھتے ہوں کہ وہ اپنے ہاں کے دیگر احباب کے ایک جگہ بلانے کا انتظام کر لیں گے ہمیں اطلاع دیں ہم انھیں ان کے ہاں کے بزم نشینان طلوع اسلام کے پتوں سے اطلاع دیدیں گے۔ اس کے بعد وہ انھیں یک جا بلانے کا انتظام کر لیں۔ لیکن آپ اس خیال میں نہ رہئے کہ آپ کے شہر سے کوئی دوسرا شخص ہمیں لکھے گا، آپ ہی پہل کیجئے۔ اگر ہمارے پاس کسی ایک مقام سے ایک سے زیادہ احباب کی طرف سے خطوط آجائیں گے تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ہر شخص اسی خیال میں رہا کہ اس کے لئے کسی دوسرے شخص نے لکھدیا ہوگا تو ہمارے پاس کسی ایک کی طرف سے بھی اطلاع نہیں پہنچے گی۔ اس میں تاخیر نہ کیجئے۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مختلف علاقوں کے احباب کو اُن کے علاقوں میں کسی ایک جگہ جمع کر لیا جائے اس لئے آپ خط لکھتے وقت اپنے علاقے یا محلے کا پتہ ضرور لکھیں آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن اس کا نتیجہ بہت مفید برآمد ہوگا۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
بندر روڈ (چوک سول ہسپتال) کراچی

تبدیلیٔ پتہ نوٹ کر لیجئے

یہودیوں کی حکومت

(ایک ہندی مسلمان)

[یہودیوں کی حکومت کے متعلق اس سے قبل طلوع اسلام میں ایک سلسلۂ مضامین شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ خیال غلط ہے کہ یہودی قیامت تک اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ زیر نظر مضمون اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔

یہ مضمون مبتدیانہ سا ہے اور اس میں اسلوب بیان کے اسقام بھی ہیں۔ لیکن اسے طلوع اسلام کی روش کے خلاف اسلئے شائع کیا جا رہا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ آج ان جذبات کے اظہار کیلئے وہاں کس طرح اجازت مل سکتی ہے؟ اور اگر یہ مضامین یہاں بھی شائع نہ ہو سکیں تو پھر وہاں کے مسلمان اپنے ان جذبات کے اظہار کیلئے کہاں جائیں؟ طلوع اسلام]

حکیم الامت حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے "ضرب کلیم" میں "اجتہاد" کے عنوان سے فرمایا ہے کہ:-

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے؟ نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق!
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں؟ آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق؟

یعنی ہندوستان (غیر منقسم ہندوستان) میں "مسلمان" کبھی بھی "حکمتِ دین" نہیں سیکھ سکتے۔ اور جوشِ تقلید اور زوالِ تحقیق کے سبب قرآن پر از خود کچھ غور و فکر کرنے کی ان میں جرأت ہی باقی نہیں رہی ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "فقیہانِ حرم" اپنے آپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور قرآن نے جو غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے اُس پر توجہ نہیں دیتے بلکہ یہ کہہ کے قرآن ہی کو بدل دیتے ہیں کہ اس کو عقل و فکر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمیں قدیم راہ سے ہٹنا نہ چاہئے۔

واقعی یہ اعتراض سو فیصدی صحیح ہے۔ ہمارے "مولوی" طبقے نے قرآن مجید کے متعلق مسلمانوں میں ادھر چند صدیوں سے یہ عام غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ اس کو سمجھنے والے صرف وہ متقدمین تھے جو گذر گئے لہٰذا جو کچھ انھوں نے سمجھا اور سمجھایا ہے وہ اٹل ہے اور اب کسی بھی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان قدیم مفسروں کو نظر انداز کر کے قرآن کو از خود سمجھنے بوجھنے کی کوشش کرے اسلئے کہ بقول صاحب "فہم القرآن" (مولوی سعید احمد اکبر آبادی):

کوئی شخص بجز اُن بزرگان کرام کے جن کو خود صاحبِ قرآن، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو، دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اُس نے سمجھا ہے۔ (صفحہ ۱۶)

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ قدیم مفسرین وہ بزرگ ہیں:-

جنھوں نے اپنی عمریں ان ہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں۔ . . . . جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسائشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خون پسینہ ایک کیا ہے۔ (ص۱۵)

قدیم مفسرین بلاشبہ قابل صد تعظیم ہیں اس لئے کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد کے علوم کے مطابق جو کچھ اور جتنا کچھ قرآن کو خود سمجھا تھا، اُسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ان کو بھی سمجھانا چاہا تھا یا سمجھایا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی مفسر نے بھی یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا تھا کہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اب قیامت تک مسلمانوں کو صرف میری ہی سمجھ پر کلیتہً اعتماد کرنا ہوگا۔ اور میری سمجھ کے علاوہ اپنی یا دوسروں کی سمجھ سے ہرگز کام نہ لینا ہوگا۔ بھلا وہ محترم حضرات ایسا کہہ ہی کب سکتے تھے جبکہ یہ آیت اُن کے سامنے تھی کہ:

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ۔ (ص ۵)

یہ قرآن مجید سارے جہان کے لئے رہبر ہے اور تم لوگ اس کی قدر تھوڑے دنوں کے بعد[1] جانو گے۔

مگر ہمارے "مولوی" نے خود ہی سمجھا ہو یا نہ ہو مگر برابر مسلمانوں کو یہی سمجھایا کہ قدیم مفسرین حضرات جو کچھ جتنا کچھ اور جیسے کچھ سمجھ اور لکھ گئے ہیں وہ اٹل ہے۔ اب نہ اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ان کا سمجھا اور لکھا ہوا بدل سکتا ہے۔ اور جو مسلمان ایسا اعتقاد نہیں رکھتا اور نہیں سمجھتا وہ "کافر" ہے۔ گویا "مولوی" کے نزدیک "تفسیر" کا انکار دراصل "قرآن" کا انکار ہے اور جو "مفسر" کا منکر ہے۔ دراصل وہ "خدا" کا منکر ہوا۔ یہی وہ گُھن ہے جو "مسلم قوم" کو کھا گیا اور یہی وہ زہر ہے جس نے مسلمانوں کا کام تمام کر دیا۔ اک زمانہ وہ تھا کہ قرآن کی کوئی تفسیر نہ تھی جس کو پڑھ کے مسلمان فائز المرام ہوں تو مسلمان خود قرآن کو پڑھ اور سمجھ کر یورپ و ایشیا کے مالک ہو گئے تھے۔ ہر جہت سے بحر و بر کے حاکم بن گئے تھے۔ اور اک دور یہ ہے کہ قرآن کو سمجھانے والی لاتعداد تفسیریں اور سینکڑوں من کتابیں ہیں مگر مسلمانوں کو سر چھپانے کی بھی جگہ کہیں نہیں مل رہی ہے اور ہر جگہ وہ کسی نہ کسی حیثیت و اعتبار سے دوسروں کے محکوم ہیں۔

ہمارا مذہبی عقیدہ اور قرآن مجید کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ حرف ناطق ہے اور یہ اس وقت تک اپنے ماننے والوں اور اس کے حکم کے مطابق چلنے والوں کی دینی اور دنیوی زندگی میں رہبری کرتا رہے گا جب تک یہ کرۂ ارض باقی ہے۔ پھر اگر قرآن ہر عہد اور دور کے علوم حاضرہ اور فنونِ جدیدہ کا حامل اور مظہر و کاشف نہیں تو وہ اُس دور یا عہد کے مسلمانوں کی کس طرح رہبری کر سکتا ہے؟ اور کرے گا؟ اگر قرآن کی ساری باتیں اور آیتیں بقول مفسرین کسی خاص واقعہ ہی سے متعلق ہیں جو اس وقت گزرا تھا جیسا کہ تفسیری روایات سے عام طور پر ظاہر ہوتا ہے تو پھر ایسا قرآن دوسرے عہدوں اور ادوار میں کیسے رہبر اور بکار آمد ہو سکتا ہے؟ مگر جب ہم اس خیال کے پیش نظر اور اس عقیدے کے تحت قدیم مفسرین کو نظر انداز کر کے جدید علوم و فنون کی روشنی میں اپنی رہبری کے لئے از خود قرآن کو سمجھنا چاہتے

---

[1] اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے:۔

وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (الحج ۶)

اور تمہارے پروردگار کا ایک دن تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار برس کے برابر ہے۔

گویا اس حساب سے اب اصلی زمانہ آیا ہے قرآن کو کچھ سمجھنے کا۔ (عالوی)

ہیں تو "مولوی" ہمیں ڈانٹتے ہیں کہ تم قرآن کو نہیں سمجھ سکتے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ:

جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم و فنون جن کی تعداد علماء نے چودہ[۱] لکھی ہے بدرجۂ کامل حاصل نہیں کریگا اُسے حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے۔ (فہم قرآن ص۲)

لہٰذا قرآن کو وہی کچھ صحیح اور اُسی طرح درست سمجھو جو اور جس طرح قدیم مفسرین نے سمجھا یا ہے۔ ہمارے یہ "مولوی" اس پر غور ہی نہیں کرتے کہ اول تو بقول حضرت علامہ اسلم جیراجپوری:-

یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں، جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہ و تابعین اور تبع تابعین صحیح اور بہتر طریقے سے سمجھتے رہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروط کا ماخذ خود قرآن ہے۔ اسی سے علماء نے ان کو نکالا ہے، پھر یہ فہم قرآن کے لئے شرط کیوں کر قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ پھر ..... وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علماء نے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے، نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے؟ (مقدمہ معارف القرآن جلد اول صفحہ ۲۹)

دوسرے "تفاسیر" تو بیشمار ہیں پھر ان میں سے کس کو قابلِ اعتبار سمجھا جائے؟ کیونکہ یہ تعدد ہی بذاتِ خاص اس بات کی مظہر ہے کہ کوئی تفسیر حرفِ آخر نہیں اور کوئی مفسر بھی دوسرے کی تفسیر سے مطمئن نہیں ہے۔ تیسرے، اور پھر چند صدیوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے پھر بھلا اُس عہد کے علم و عقل اور عقیدے کے مطابق سمجھا ہوا قرآن موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے سند کیسے ہو سکتا ہے؟ اس زمانے کے علم و عقل اور عقیدہ کے مطابق لکھی ہوئی تفسیریں اس زمانے میں مسلمانوں کا ایمان و اعتقاد کس طرح درست و برقرار رکھ سکتی ہیں۔

آیئے مثال کے لئے ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ سورۂ آل عمران کے مارہویں رکوع کی دو آیتیں یہ ہیں۔ پہلی آیت ہے:-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ( )

تم بہترین امت ہو جس کو اسلئے منتخب کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو عمدہ باتیں بتائے اور بری باتوں سے روکے۔

اس آیت میں ایک جماعت کو بشارت دی گئی ہے کہ تم دنیا کی بہترین جماعت ہو اور تم کو یہ عزت و حشمت اور یہ سطوت و عظمت اسلئے دی گئی ہے کہ تم، تمام بنی نوع انسان کو اعلیٰ باتوں کا حکم دو اور بری باتوں سے روک دو۔ دوسری آیت یہ ہے:-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ[۱]

ان پر ذلت مسلط کر دی گئی چاہے وہ جہاں کہیں بھی پائے گئے مگر ہاں یہ کہ اللہ کی طرف سے یا دوسرے آدمیوں کی طرف سے کہیں پناہ مل گئی ہو۔ اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان پر پستی مسلط کر دی گئی۔

---

[۱] اشرف علی تھانوی "اعمال قرآنی" (صفحہ ۸۶) میں فرماتے ہیں:-

"یہ آیتیں دشمن پر فتحیابی کے لئے ہیں۔ کسی ہتھیار پر شنبہ کے روز چھٹی ساعت میں اس کو کندہ کرے اور کرنے والا روزہ سے ہو۔ وہ ہتھیار لیکر جو شخص مقابلۂ دشمن میں جائے گا فتحیاب ہوگا۔" (ہالوی)

اس آیت سے قبل سورۂ بقرہ کے ساتویں رکوع میں بھی اسی مفہوم کی ایک آیت یہ ہے :-

ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ ذالک بانھم کانوا یکفرون بایٰت اللہ

ان پر ذلت و پستی مسلط کر دی گئی اور وہ مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے - یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کفر کرتے تھے آیاتِ الٰہی کے ساتھ -

ان دونوں آخری آیتوں میں ایک جماعت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ چونکہ وہ مجرم اور سخن ناشنو ہے اسلئے اُس پر ذلت اور پستی مسلط کر دی گئی ہے

اب آیئے تفسیروں کی طرف - قرآن مجید کی تفسیریں اس قدر لکھی گئی ہیں کہ شاید ان کی صحیح تعداد کوئی بھی نہیں بتا سکتا اور وہ سب کی سب تقریباً ہم آواز ہیں :-

(۱) سب سے پہلی تفسیر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی ہے - یہ تفسیر اسلام میں پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر ہے - اسی لئے اس کو "ام التفسیر" کہتے ہیں - اس کے بعد جتنی تفسیریں لکھی گئیں سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں - اس میں ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں - (اسلم جیراجپوری)

(۲) تین قسم کی احادیث میں بُری طرح تحریف ہوئی ہے - پیشینگوئیاں - جنگیں - اور تفسیری احادیث - (امام احمد حنبل)

(۳) امام ابن جریر طبری کے بعد جسقدر تفسیریں لکھی گئیں ان کو کون شمار کر سکتا ہے ؟ صرف "کشف الظنون" میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے، نو سو تفسیریں نام بنام مندرج ہیں - نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب "اکسیر" میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں - اگر دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج یقیناً وہ کئی ہزار تک پہنچیں گی - (اسلم جیراجپوری)

(۴) اسلامی علوم میں سب سے زیادہ تصنیفیں جس فن میں لکھی گئیں وہ "تفسیر" کا فن ہے - تاریخی حوالوں اور سندوں سے ثابت ہے کہ کئی ہزار مستقل کتابیں اس فن میں تصنیف ہوئی ، . . . . . لیکن جو سرمایہ ہے گو بظاہر بہت کچھ ہے - لیکن در حقیقت ایک ہی نغمہ ہے جو مختلف سازوں سے ادا ہوا ہے - آٹھ سو برس کی وسیع مدت میں ہزاروں لاکھوں اہل فن پیدا ہوئے لیکن ان تمام قالبوں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے " (علامہ شبلی نعمانی)

(۵) اسلام کی ابتدائی صدیوں سے قرون اخیرہ تک جسقدر بھی مفسر پیدا ہوئے ، ان کا طریق تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے . . . . . ہر شخص جو تفسیر کیلئے قدم اٹھاتا تھا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھا - اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ غلطی برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے - کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کیلئے "تقلید" سے الگ ہو کر "تحقیق" تو کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے ؟ (ابو الکلام آزاد)

ظاہر ہے کہ شاید اب شبہ نہ رہے گا اگر ہم یہ کہیں کہ متذکرہ بالا تینوں آیتوں کے متعلق بھی ساری تفسیریں ہم رائے ہیں اور کل مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ پہلی آیت مسلمانوں کے متعلق ہے اور اس میں جو قومی سعادت و سرفرازی مسلمانوں کو بخشی گئی ہے وہ ابدی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے - اسی طرح آخری دونوں آیتیں پوری قوم یہود سے متعلق ہیں اور ان میں جو سزا یہودیوں کی تجویز یا بیان ہوئی ہے وہ بھی رہتی دنیا تک کیلئے ہے -

ہمارے مفسرین کی طرف سے یہ قطعی اور حتمی طور پر طے کر دیا گیا، آخری اور ابدی فیصلہ سنا دیا گیا کہ اب کبھی بھی قوم یہود، دنیا میں باوقار نہ ہوگی بلکہ ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہے گی۔ نہ صرف اتنا بلکہ یہ بھی فرما دیا گیا کہ اب اس قوم کا نہ تو کبھی دنیا میں کہیں "وطن" بنے گا اور نہ قیامت تک اب ان کی کہیں اور کسی طرح بھی حکومت قائم ہوگی۔ اس خیال کی تازہ ترین تصدیق و توثیق کے لئے مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کی کتاب "قصص القرآن" کا کچھ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کتاب تمام قدیم و جدید تفاسیر و احادیث اور تراجم و تصانیف کو سامنے رکھکر ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں تالیف اور شائع ہوئی۔ اس کی تیسری جلد میں ایک عنوان "بیت المقدس اور یہود" ہے جس میں متذکرہ بالا (ضربت علیھم الذلۃ ...) قرآنی آیت سے بحث کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:-

(۱) "نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جو ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ اُبھرے اور نہ قیامت تک کبھی بھی اب صاحب حکومت ہو سکیں گے"۔ (ص۲۲۱)

(۲) "غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی بھی نہ اُبھرے اور اپنی کینہ اور ظالمانہ حرکات علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے"۔ (ص۲۲۷)

(۳) "غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی اُن کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا .... اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو پھر کبھی حرمت نصیب ہوئی اور نہ حکومت۔ اور آج بھی وہ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت و حکومت سے محروم ہیں اور قیامت تک محروم رہیں گے۔ اور دنیا کی جو طاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر مسطورہ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسر حکومت و اقتدار لانا چاہے گی وہ کبھی بھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہر الٰہی کا شکار ہو کر یہودی کی طرح ذلت و خسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لئے عبرت و بصیرت بنے"۔ (ص۲۲۹)

یہ تھا وہ خیال و عقیدہ جو قدیم تفسیروں اور انہیں کے سبب جدید کتابوں میں موجود ہے اور جن کو برابر ہم نے پڑھا تھا اور جو ہمیشہ ہم کو سمجھایا گیا تھا اور جن پر ہمارے "مولوی" ہمیشہ زبان و قلم کا سارا زور صرف کرتے تھے اور جن کے متعلق ہمیں کہا اور سمجھایا جاتا تھا کہ یہ خدائی فیصلہ ہے اور قرآن مجید میں مذکور ہے، مگر ہم نے دیکھا کیا؟

دیکھا یہ کہ عین عالم اسلام کے قلب اور ارض مقدس میں یہودیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے اپنا "وطن" منوا اور بنا لیا۔ اور پھر وہاں انہوں نے ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک ایسی "حکومت" بھی قائم کر لی جو مسلمانوں کی موجودہ ساری بڑی چھوٹی حکومتوں سے اقتصادی، مادی اور فوجی حیثیت سے بہتر اور مضبوط ہے۔ اس کے قیام کے ایک ہفتہ کے اندر اندر ہی اُسے دنیا کی ساری بڑی حکومتوں نے مان لیا تھا یہاں تک کہ موجودہ دور کی سب سے زیادہ مضبوط مسلم حکومت "ترکی" نے بھی۔

دیکھا یہ کہ اس "حکومت اسرائیل" کے خلاف جب کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ والی جماعت نے اس جماعت کے افراد نے جن کا یہودیوں نے ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۴۹ء میں مار مار کے کچومر نکال دیا تھا، ہنگامہ برپا کیا تو ارض مقدس کی سرزمین کو یہودی نوجوانوں نے مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا کاش "مولوی" ان غریب عربوں کو اُس وقت یہ بتلاتے کہ حضرت علامہ اشرف علی صاحب تھانوی نے "اعمال قرآنی" (صفحہ

میں اس آیت کے متعلق فرمادیا ہے کہ:-

یہ آیتیں دشمن پر فتحیابی کے لئے ہیں۔ کسی ہتھیار پر شنبہ کے روز چھٹی ساعت میں اس کو کندہ کرے اور کرنے والا روزہ سے ہو، وہ ہتھیار لیکر جو شخص مقابلہ دشمن میں جائے گا وہ فتحیاب ہوگا۔

دیکھا یہ کہ جو مسلح فوج بھی ارض مقدس پر یہودی فوج کے بالمقابل ہوئی اُس نے منہ کی کھائی۔ جتنے کمانڈر آگے بڑھے انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا گیا۔ اور جس ملک نے منہ زوری دکھائی اُس کے خود جان کے لالے پڑگئے یہانتک کہ جب مصر کی مسلح فوج نے کچھ زیادہ حرارت دکھائی تو اسے عساکر یہود نے اس بری طرح پسپا کیا کہ کہیں ٹکنے تک کا موقعہ نہ دیا اور پیچھا کرتی ہوئی یہودی فوج چالیس میل مصری حدود میں داخل ہوگئی جو پھر "طاقت" سے نہیں واپس کی جاسکی بلکہ "مفاہمت" سے۔

دیکھا یہ کہ اس وقت "حکومت اسرائیل" ارض مقدس کے سات ہزار آٹھ سو مربع میل سرسبز و شاداب اور زرخیز و جنت نظیر رقبہ پر نہایت شان سے قائم ہے اور اس کی بارہ لاکھ ۵۱ ہزار نفوس پر مشتمل آبادی ہیں، ایک لاکھ ستر ہزار کنتم خیر امۃ کی شان رکھنے والے مسلمان عرب ضربت علیھم الذلۃ والی قوم کی غلامی کی زنجیریں اپنے گلے میں ڈالے اس طرح پڑے ہیں کہ نہ تو وہ خود سرک سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا مسلمان ان کی طرف ایک انچ بھی سرک سکتا ہے۔ غرض ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا، کیا بتاؤں؟

كَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۔ ( )

بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہوگیا ہے اور جس کو خدا ہی ذلیل کرے اس کو پھر کون ہے عزت دینے والا؟ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

یہانتک تو اس کا ذکر ہوا جو ہو چکا اور دیکھا جا چکا ہے اب آئندہ کے لئے یہودیوں کا کیا پروگرام ہے؟ اس کے متعلق "حکومت اسرائیل" کے وزیر اعظم کا وہ بیان ملاحظہ فرمالیجئے جو "نیویارک ٹائمز" کی اشاعت مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے۔ چند ٹکڑے سن لیجئے۔

(۱) میں اس بات کو باور نہیں کرتا کہ ہم پیدائشی طور پر خدا کے چہیتے ہیں۔ لیکن ہم یہ خواب ضرور دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا نظام تمدن ایسا ہو جس سے ہم دنیا کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کرسکیں۔ ہمارے اس تمدن کی بنیاد ہمارے انبیاء کی تعلیمات پر مبنی ہوگی جس میں سائنس کی تمام خوبیاں موجود ہوں گی۔ جب میں "انبیاء" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمات کا تمام اخلاقی پہلو ہماری سوسائٹی میں موجود ہوگا۔ اور جب میں "سائنس" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا نظام تمدن ہر قسم کی مادی ترقیات کا حامل ہوگا اور اس طرح ہم "مشرق وسطیٰ" کیلئے ایک نمونہ کا ملک بن جائیں گے۔

(۲) اس وقت ہمارے سامنے دو بنیادی مقصد ہیں۔ پہلا مقصد یہودی آبادی کو "اسرائیل" میں منتقل کرنا اور دوسرا ملک کو زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ بنانا۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے دس سالہ پروگرام بنایا ہے۔ ہم ان مغضوب و مقہور یہودیوں کی ایک کوشش کا نتیجہ دیکھ چکے کہ (ہمارے علماء حضرات کے قول کے مطابق) خدا کے اس قاہرانہ فیصلہ کے باوجود کہ اب قیامت تک کبھی اور کہیں ان کی حکومت قائم نہ ہوگی۔ انھوں نے اور کہیں نہیں بلکہ "ارض مقدس" میں اپنی ایک حکومت بنا ہی ڈالی۔ اور پھر ہر چند کہ خدا کے محبوب بندوں کی متحدہ کوشش بھی ہوئی کہ فوجی طاقت سے

اس حکومت کا خاتمہ کر دینگے مگر اس کا بال تک بیکا نہ ہو سکا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہودیوں کا یہ ارادہ، حوصلہ اور پروگرام بھی عملی جامہ نہیں پہن سکیگا؟

"مولوی" طبقہ کی طرف سے اب بھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اس سلطنت کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ حکومت ناقابلِ ذکر ہے اسلئے کہ یہ قیام وطن و حکومت، مغربی اقوام کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے اور یہ حکومت باقی رہنے والی نہیں بلکہ عنقریب مٹ جانے والی ہے۔ بھلا دیکھئے تو کس قدر فرسودہ عذر ہے؟ اس سے تو بحث نہیں ہے کہ یہ حکومت بنی کیسے؟ اپنے بل بوتے پر یہودیوں نے بنائی ہو یا دوسروں کے سہارے؟ آپ نے یہ تو کبھی کہا نہیں تھا کہ اگر یہودیوں کی کبھی کوئی حکومت قائم ہوئی تو دوسروں کے سہارے قائم ہوگی؟ آپ کا تو دعوٰی اور قطعی فیصلہ تھا کہ اب کبھی، کسی طرح اور کہیں بھی یہودیوں کی حکومت قائم نہیں ہوگی آپ تو کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی اور حتمی فیصلہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے بلکہ آپ کا تو واضح طور پر یہ بھی دعوٰی تھا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسا فرما دیا ہے اسلئے نہ صرف یہ کہ اب خود یہود کبھی اور کہیں بھی وطن و حکومت نہ بنا سکیں گے بلکہ جو دوسری طاقت یا حکومت بھی ایسا مذموم فعل کرنے کی کوشش کرے گی وہ بھی ناکامیاب ہوگی اور ایسا کرنے کے جرم میں خود بھی مٹ جائے گی؟[1] اسی طرح اب یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ یہ حکومت باقی نہ رہے گی اور عنقریب مٹ جائے گی۔ یہاں تک کہ شامی مندوب المصر الشکری نے تو پیشینگوئی بھی کر دی ہے کہ:-

اسرائیلی اسٹیٹ ۹ر نومبر ۱۹۵۵ء تک عربوں کے مسلح اقدام کے بغیر خود بخود ختم ہو جائے گا اور اقوام متحدہ کو اسرائیلی مملکت کو دیوالیہ[2] قرار دینے کے لئے بین الاقوامی کمیشن مقرر کرنا پڑے گا۔

یہ سلطنت و حکومت آئندہ بھی قائم اور باقی رہے یا نہ رہے، ۱۹۵۵ء کے بجائے ۱۹۵۲ء ہی میں مٹ جائے اس سے کیا ہوگا؟ کتنی حکومتیں اب تک بن اور مٹ چکی ہیں۔ اور تو اور خود مسلمانوں کی قائم کی ہوئی حکومتیں مٹ چکی ہیں۔ اسی طرح اگر اسرائیل ختم ہو جائے تو کیا یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ جو کچھ قدیم تفسیروں میں لکھا یا اب تک "مولوی" کی زبانی اس سلسلے میں بیان ہوتا رہا ہے وہ صحیح تھا؟ پھر لطف دیکھئے کہ جو سلطنت (علماء کے قول کے مطابق) خدائے تعالیٰ کے نہ چاہنے کے باوجود (نعوذ باللہ من ذالک) بن گئی۔ جو حکومت مسلمانوں کی متحدہ عسکری طاقت سے بھی نہ مٹی، اس کے بارے میں اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ "دعا" سے مٹ جائے گی۔ یہاں سوال تو صرف اتنا ہے کہ یہ حکومت قائم ہی کیونکر ہوگئی اور یہودیوں کا وطن بنا ہی کیسے جبکہ بقول آپ کے خدا نے فیصلہ کر دیا تھا اور قرآن میں بیان بھی کر دیا تھا کہ اب دنیا میں یہودیوں کا قیامت تک نہ کہیں وطن بنے گا اور نہ ان کی حکومت قائم ہوگی؟ لطف دیکھئے کہ اب بد دعا کی جا رہی ہے پیشینگوئی فرمائی جا رہی ہے کہ وہ یہودی اسٹیٹ جو خدا کی مرضی اور فیصلۂ الٰہی کے خلاف قائم ہو گیا ہے اور مسلمانوں کی فوجی طاقت سے

---

[1] میں نے حفظ الرحمٰن صاحب کی کتاب "قصص القرآن" کا جو حوالہ قبل میں دیا ہے وہ طبع اول سے نہیں جو ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی بلکہ طبع ثانی سے جو ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی ہے یعنی جو کتاب "حکومت اسرائیل" کے قیام کے چار پانچ ماہ بعد شائع ہوئی تھی۔ یہ اس ہٹ دھرمی کے ثبوت کیلئے تھا کہ "مولوی" ہنوز اور اب بھی یہی کہے جا رہے ہیں۔ (ح)

[2] یہ اُس قوم کی مملکت کے بارے میں فرمایا گیا ہے جس کے چار افراد اس وقت دنیا کے اُن نو مالداروں میں سے موجود ہیں جو ذاتی دولت اور انفرادی مال کے مالک ہونے کی حیثیت سے دنیا میں مشہور ہیں۔

بھی اب تک نہ ٹوٹا ہے وہ اب

"عربوں کے مسلح اقدام کے بغیر خود بخود ختم ہو جائے گا"

یہ کس طرح صاحب؟ کیا یہ کام مسیح و مہدی آکر کریں گے؟ حد ہے بے علمی اور ہٹ دھرمی کی۔ نعوذ باللہ!

[اس کے بعد بالوی صاحب نے اس امر سے بحث کی ہے کہ قرآن میں یہ کہیں نہیں آیا کہ یہود اپنی حکومت کبھی قائم نہیں کر سکیں گے چونکہ اس موضوع پر اس سے پہلے طلوع اسلام میں کافی بحث ہو چکی ہے اسلئے ہم نے مضمون کا اتنا حصہ حذف کر دیا ہے۔ طلوع اسلام]

اب سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے متعلق "کنتم خیر امۃ" آیا تھا اور یہودیوں کے لئے "ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ" اور یہ فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ یعنی قیامت تک کیلئے تھا تو ارض فلسطین پر اس کا ظہور الٹا کیونکر ہوا؟ جواب صاف ہے کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا اور ایک نادرست خیال از خود قائم کر لیا گیا اسلئے یہاں فیصلہ الٹا نظر آرہا ہے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صحیح ہے۔ قرآن کا فرمان یہ ہے کہ

ان الارض یرثھا عبادی الصّٰلحون ( ) زمین کے وارث و مالک ہمارے وہی بندے ہوا کرینگے جو صاحب صلاحیت ہوا کرینگے۔

چنانچہ جب یہودیوں میں اس کی اہلیت و صلاحیت تھی تو ان کو سب کچھ ملا ہوا تھا مگر جب انھوں نے اس صلاحیت کو کھو دیا اور یہ اہلیت گنوا دی تو پھر سنت الٰہی یہ تھی کہ

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ( ) اگر تم نے روگردانی کی تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو دیدیں گے۔

چنانچہ عربوں کو سرفراز کیا گیا اور یہودیوں سے سلطنت چھین کر مسلمانوں کے حوالہ کر دی گئی اور یہودیوں کو ذلیل و خوار کر دیا گیا۔ اب پھر جب اُدھر یہودیوں نے اپنے میں وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جو حصول سلطنت کیلئے ضروری تھیں اور عربوں نے یہ ساری صلاحیتیں کھو دیں تو پھر ان سے زمین کی وراثت چھین کر صاحب صلاحیت، یہودیوں کے حوالہ کر دی گئی اور اُن پر بجلئے دوسری قوم کے، وہی قوم مسلط کر دی گئی جس کی دائمی ذلت و مسکنت کے وہم میں وہ مبتلا تھے۔

"مسلمان" اپنے مفسروں کے ذاتی خیال سے مسحور ہو کر اپنے "مولوی" کے عقیدے اور قول کو "قرآن" کا درجہ دے بیٹھے، ان کی غلط تعلیمات کے پیش نظر "کنتم خیر امۃ" کو اپنے لئے بغیر کچھ کئے ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک کا اٹل فیصلہ متصور کر بیٹھے اور سمجھ لیا کہ اب عزت و حکومت جاتی کہاں ہے چاہے ہم کچھ کریں یا نہ کریں اور اس نشہ میں ایسے چور ہوئے کہ انھوں نے قرآن کی ساری تنبیہوں اور تاکیدوں کو پس پشت اور نظر انداز کر دیا۔ پھر یہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ (نساء ۱۸)

نہ تمہاری تمناؤں پر کام چلتا ہے اور نہ دوسرے اہل کتاب کی تمناؤں سے جو بھی میرے حکم کے خلاف کرے گا وہ ضرور سزا پائے گا۔

قرآن نے جبکہ کہ نسلی و قومی برتری یا ملکی و مذہبی تفوق کا سوال ہے، واضح لفظوں میں فیصلہ سنا اور بتا دیا تھا کہ میرے یہاں یہ کوئی

چیز ہی نہیں ہے۔ یہاں تو شرافت و رذالت کا معیار صرف یہ ہے کہ کون میرے احکام کی پوری پوری پابندی کرتا ہے؟

قرآن نے عربوں اور مسلمانوں کو خدائی اصول سے واضح الفاظ میں واقف اور باخبر کر دیا تھا کہ قوموں کو دی ہوئی نعمت چھین بھی لی جاتی ہے اگر وہ بدل جاتے ہیں:۔

ان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علیٰ قوم حتی یغیروا ما بانفسھم ( )

اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اسوقت تک نہیں چھینتا ہے جب تک کہ وہ قوم خود اپنے ہی کو نہیں بدل ڈالتی ہے۔

یہ سب بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے دارالاسباب کی مادیت کی طرف بھی توجہ دلا دی تھی۔ مستقلاً ایک سورہ ہی لوہا (حدید) کے عنوان سے نازل کر دی تھی تاکہ عنوان کی اہمیت کے سبب وہ نظر انداز نہ ہونے پائے اور اس میں یہ واضح اشارات پیش کر دیئے تھے کہ:۔

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ( )

اور ہم نے وہ اتارا ہے جس میں ایک طرف تو شدید ہیبت ہے اور دوسری جانب بنی نوع انسان کیلئے بڑے بڑے منافع۔ اور یہ صرف اسلئے کہ دیکھیں لوگ بے دیکھے خدا اور اس کے رسول کی کیسی مدد کرتے ہیں۔

اشد اللہ "لوہا" کے دونوں پہلو تو پیش کر دیئے گئے تھے۔ خوفناک ٹینکوں اور اژدر دہاں توپوں کی حشر سامانیاں اور تباہ کاریاں بھی۔ اور پھر عظیم الشان فیکٹریوں اور سونا اگلنے والی ملوں کی صناعیاں اور منافع بازیاں بھی۔ سمجھا تو دیا گیا تھا کہ "حدید" کیا ہے؟ دشمنوں کے لئے "حد" اور مخالفوں کے لئے "ید"۔ توپ سے دشمنوں کو نقصان پہنچاؤ اور مشنری سے دوستوں کو فائدہ۔ خوفناک و ہیبتناک اسلحہ بھی اس سے بناؤ اور مفید مشنریاں بھی سے

گزر جا بن کے سیل تیز رو کوہ و بیاباں سے	گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر	شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

(اقبال)

متذکرہ بالا آیت میں لفظ "باسٌ شدید" آیا ہے جس کا ترجمہ "شدید ہیبت" کیا گیا ہے۔ دراصل اس لفظ میں اعلیٰ درجہ کی عسکری و آہنی طاقت کا مفہوم پنہاں ہے۔ یعنی "لوہا" سے وہ مہلک آلے اور مہیب اسلحہ بنا جن سے قاہرانہ جنگ کی جا سکے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے اور سورۂ نمل کے تیسرے رکوع میں یہ لفظ "اشد جنگجو" کے معنی میں آیا ہے۔ اگر مسلمان بے عمل ہو کر "روحانیات" کا ڈھونگ نہ رچاتے تو یقیناً وہ "طاقت" کو قائم اور باقی رکھتے بلکہ بڑھاتے رہتے جو ایک زندہ قوم کی بقاء کے لئے ضروری چیز اور لازمی شے ہے۔

بہر حال قرآن نے "لوہا" کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور اس کے دونوں منفی و مثبت اور مفید و مضر پہلوؤں کی بھی نشان دہی کر دی تھی اور صرف "لوہا" کی فضیلتوں اور اس کے فوائد کے ذکر پر ہی اکتفا نہ کی تھی بلکہ بطور خاص، نہایت واضح طور پر صاف لفظوں میں کھول کر تاکیداً یہ ناطق حکم بھی صادر کر دیا تھا کہ جس طرح خدا پرستی میں پیش قدم ہو اسی طرح مادی ترقی میں بھی تم ساری دنیا والوں سے آگے ہی رہو:۔

واعدوا لھم ما استطعتم من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم

(لا تعلمونهم الله يعلمهم)

اور جس قدر بھی ممکن ہو سکے تم سامان قوت بہم پہنچاؤ اور سب چیز ہر وقت درست رکھو تاکہ اس کے باعث تمہارا رعب ان پر غالب رہے جو تمہارے دشمن ہیں اور اللہ کے بھی اور ان لوگوں پر بھی خوف طاری رہے جن کو تم تو نہیں جانتے ہو مگر اُن کو اللہ جانتا ہے۔

لیکن جب مسلمان یہ سب کچھ فراموش کر بیٹھے تو یہودی ان سے حکومت چھین نہ لیتے تو اور کیا ہوتا؟ اس کے لئے دعا دیجئے ان علماء فلسطین کو جنہوں نے فلسطینی مسلمان عربوں کے دماغوں میں یہ اتار دیا تھا یا برابر اتارے رکھا کہ اب تم کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ اور قیامت تک کے لئے تمہاری شان میں "کنتم خیر امۃ" آچکا ہے اور ان کمبخت یہودیوں کا خیال نہ کرو کہ ابدی ذلت و مسکنت ان پر مسلط کی جاچکی ہے اب نہ تو ان کو دنیا میں کہیں عزت کی زندگی ملے گی اور نہ ان کی قیامت تک کہیں حکومت و سلطنت قائم ہوگی۔ باقی رہا قرآن اور اس کی سورۂ حدید سو اس کے متعلق یہ بتا دیا کہ

صبح بلا ناغہ سورۂ حدید کا پڑھنا باعث رحمت ہے اور تمام دن خوشی و خرمی سے گذرتا ہے اور کسی سے منادب نہیں ہوتا۔

(مقدمۂ قرآن از تھانوی صاحب)

اور اس کے ساتھ حدیث سنائی تو یہ کہ

قال رسول اللہ صلعم من لم یکن عندہ صدقۃ فلیلعن الیہود۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۱۱۱)

جس شخص کے پاس صدقہ کیلئے کوئی چیز نہ ہو وہ یہودیوں پر لعنت بھیج لیا کرے، یہی اس کا صدقہ ہے۔

اور اسلام کی صداقت کا فلسفہ ان الفاظ میں سمجھایا جا رہا ہے:

اور بیشک اسلامی سلطنت کے لئے یہ لازم ہے کہ اس کی عسکری طاقت بہت مضبوط ہو۔ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة (ان کے لئے جہانتک تم طاقت رکھو، قوت مہیا کرو) لیکن اسلام اور خود مسلمانوں کا بقاء و تحفظ عسکری طاقت پر موقوف نہیں اور نہ تبلیغ و اشاعت اسلام کیلئے عسکری قوت کی ضرورت ہے۔ اسلام صداقت ہے اور صداقت خود ترقی کیا کرتی ہے۔ آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو تاریکی خود کافور ہو جاتی ہے۔ (اخبار الجمعیۃ ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء ص۱ از محمد میاں صاحب)

آگے بڑھ کر ارشاد ہوتا اور سمجھایا جاتا ہے کہ

انزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس۔ . . . . منجنیق ایجاد ہوا جس نے رفتہ رفتہ بندوق، مشین گن، توپ، ٹینک وغیرہ کی شکلیں اختیار کر لیں۔ . . . . بیسویں صدی میں دنیا ترقی کی بہت اونچی سطح پر پہنچ چکی ہے لہذا دفاع کیلئے بھی بلند پرواز ذرائع ایجاد ہوئے اور جو توپیں زمین پر تھیں اب بار ہوائی جہازوں کے ذریعے ان کو آسمان کی بلندی پر لیجایا گیا ـــ مگر ـــ کیا ان تمام ترقیوں کے باوجود انسان اطمینان اور سکون کی دولت سے ہمکنار ہو سکا؟ ـــ وہ تمام ذرائع جن کے متعلق ہم خیال کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو حاصل ہوں تو ان کو اطمینان نصیب ہو اور ان کا خوف و ہراس دور ہو، اس مقصد کیلئے قطعاً ناکارہ ہیں۔ ناکام ہیں۔ بے سود ہیں اور ان کے فقدان پر ماتم کرنا عبث ہے۔ (رمش)

مسلمانوں کے لئے دین اور دنیا دونوں میں عزت و فلاح کا پورے قرآن سے جو ایک مجرب نسخہ نکالا یا چنا گیا یا تجویز ہوا ہے وہ بھی سن لیجئے صفحہ ۹ پر ارقام فرمایا جاتا ہے کہ

قرآن کریم خوف و ہراس کے دور کرنے اور طمانیت حاصل کرنے کا ایک کیمیائی نسخہ بیان فرماتا ہے۔ نسخہ نہایت سہل الحصول کم خرچ بلکہ بلا خرچ ہے . . . . . اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں اسی نسخہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون — ( )

جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر اس پر جم گئے۔ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یعنی بیٹھے بیٹھے "ربنا اللہ" کا ورد کرتے رہیئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

جس طرح آج مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جماعتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آتی ہیں، یہی کچھ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ لیکن اس میں اور اُس میں فرق کیا تھا۔ اس کی تفصیل، ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں سنئے جو غبار خاطر میں لکھتے ہیں:۔

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا اور مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی۔ اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد عقلیتیں آشکارا ہو گئی تھیں۔ یورپ "مذہب کے مجنونانہ جوش" کا علمبردار تھا اور مسلمان "علم و دانش" کے علمبردار تھے۔ یورپ "دعاؤں" کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا اور مسلمان "لوہے اور آگ" کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف "خدا کی مدد" پر تھا۔ اور مسلمانوں کا "خدا کی مدد" پر بھی تھا لیکن "خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے سروسامان" پر بھی تھا۔ ایک "صرف روحانی قوتوں" کا معتقد تھا۔ دوسرا "روحانی اور مادی دونوں" کا۔ پہلے نے "معجزوں کے ظہور" کا انتظار کیا۔ دوسرے نے "نتائج عمل کے ظہور" کا۔ "معجزے" تو ظاہر نہیں ہوئے لیکن "نتائج عمل" نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔

یہ مقابلہ مصر میں تیرہویں صدی عیسوی میں عیسائیوں کی قہار و جبار تعداد اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ ابوالکلام صاحب آزاد نے آگے چل کر ایک فرانسیسی مجاہد "ژوائن ویل" کی زبانی واقعہ نقل کیا ہے جو خود اُس جنگ میں بحیثیت سپاہی موجود تھا جبکہ مسلمانوں نے مصر پر حملہ کیا تھا۔ "ژوائن ویل" نے اپنی ڈائری میں پہلی شب کا واقعہ لکھا ہے۔ جس کو موصوف یوں پیش کرتے ہیں:۔

ایک رات جب ہم ان برجوں میں جو دریا کے راستے کی حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے پٹریری (منجنیق) کہتے ہیں لا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا ہمیں مشورہ دیا کہ . . . . جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہئے کہ گھٹنے کے بل جھک کر اپنے نجات دہندہ خداوند سے ہم دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔

یہ اسلئے تھا کہ مسلمان مجاہدین صرف مندرجہ بالا مجرب نسخہ کو کافی اور بس نہ سمجھ کر جدید آلاتِ حرب سے بھی مسلح تھے اور فرانسیسی دستے کے پاس محض پرانے دستی خنجر اور دعاؤں کے چند رٹے ان سمجھے ہوئے الفاظ۔ یہ اسلئے تھا کہ مسلمان سورۂ حدید[1] کی غرض و غایت سے باخبر

[1] میرے ایک مخلص کرمفرما کہتے تھے کہ ان کے شہر میں ایک مرتبہ ایک مسلمان پہلوان کی کشتی ایک ہندو پہلوان سے ہونی تھی۔ مسلمان پہلوان اکھاڑہ میں داخل ہونے سے پہلے ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا جلدی سے سورۂ حدید پڑھ کر پھونک دو دیکھتا انتظار ہو رہا ہے۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ ایک مولوی صاحب نے بتایا ہے کہ اگر کشتی سے پہلے سورۂ حدید پڑھوا کے پھنکوا لیا جائے تو بدن لوہے کے مانند سخت ہو جاتا ہے اور شکست نہیں ہوتی۔ یہ ہے سورۂ حدید کا فائدہ و مصرف ہمارے یہاں۔ (

"واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ" کے حکم پر بھی عامل تھے۔ برخلاف ان کے عیسائی محض گھٹنے ٹیک کر دعا کرنے ہی کو دشمنوں کی شکست کے لئے سب سے بڑا حربہ سمجھتے تھے۔ موصوف آگے لکھتے ہیں:-

لیکن آئندہ کا یہ یقین، خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ حالت تیرہویں صدی عیسوی کی تھی لیکن چند ہی صدی کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا تو اب صورت حال یکسر الٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد حقائق اسی طرح نمایاں تھے لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی وہ اب مسلمانوں کی ہو گئی تھی اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی اُسے اس مرتبہ یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے "جامع ازہر" کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ "جامع ازہر میں "صحیح بخاری" کا ختم شروع کرا دینا چاہئے اسلئے کہ انجاح مقاصد کیلئے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ابھی "صحیح بخاری" کا ختم ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات جو قلمبند کئے ہیں وہ بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔

"توپ" کا مقابلہ مسلمانوں نے صرف "صحیح بخاری" کے "ختم" سے ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کے پاس اور بھی اسلحہ ہیں سن لیجئے کہ انیسویں (۱۹) صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں "ختم خواجگان" پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں، شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، اِدھر "ختم خواجگان" کے حلقے میں لوگ بیٹھے ہوئے "یا مقلب القلوب یا محول الاحوال" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف "گولہ بارود" ہو اور دوسری جانب "ختم خواجگان"۔

"دعائیں" ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر ان ہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کیلئے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔ (غبار خاطر۔ ص۱۸۵ (۱۹۴، ۱۹۶))

معلوم ہے کہ بخارا کی اس ہولناک مصیبت کے وقت "ملا" کیا خدمت انجام دے رہے تھے؟ بخارا کا ایک اشتراکی مخبر G. Qumelzinoty چشم دید حالات لکھتا ہے کہ اس وقت:-

ہاتھوں میں قرآن تھامے اور کپڑے پھاڑے ہوئے ملا چلا رہے تھے کہ

"خدا ان یزیدوں کو غارت کرے"

کس طرح بخارا "موزی" کے ذریعے اشتراکی روس کے قبضے میں چلا گیا؟ یہ آپ مشہور یہودی مصنف جوشا کونٹز (Josha Kunitz) کی مشہور کتاب "Down over Samarqand" میں پڑھ لیجئے۔ وہ لکھتا ہے کہ سقوط کے بعد بھی گوریلا دستوں نے جو دیہاتی مسلمانوں پر مشتمل تھا ۱۹۲۶ء تک ہم لوگوں کا ناطقہ بند کئے رکھا تھا مگر کمیونسٹوں کی خوش قسمتی سے:

مسلمان بزرگ اور علماء بالشوزم کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے اور گوریلا گروہوں کی مخالفت پر کمربستہ۔

چنانچہ بطور نمونہ اس نے بخارا کے مشہور عالم فخر الدین خدیو کا ایک بیان یہ پیش کیا ہے کہ

میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہمارے ملک میں امن و آشتی قائم کر کے اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ زدوں کا دستگیر اور کفیل ثابت کیا ہے۔ حکومت نے یہ چیز لازم سمجھی ہے کہ غریب طبقہ میں تمام زمین کو بانٹ دیا جائے۔ حکومت کے اس مبارک فعل پر میں اُسے دعا دیتا ہوں۔ یہ فعل عین نبی کی سنت ہے جو یہودیوں کا محض اسلئے قرض ہو گیا تھا کہ مفلسوں اور فاقہ کشوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔

مصنف مذکور خوش ہو کر لکھتا ہے کہ

اس سے زیادہ اور کیا ہوتا؟ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار احکام الٰہی کو ترک کر کے الحاد و بالشوزم قبول کر لیا گیا۔ . . . . بالشویکوں کا کوئی زبردست سے زبردست خلاف مذہب پروپیگنڈا بھی اتنا غارت گر ثابت نہ ہوتا جتنا کہ خود ان خادمان دین کی حماقت و خود غرضی کا بے وقا رویہ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔

جب بات یہانتک پہنچ چکی ہے تو مصر کے مشہور فلاسفر و مفسر علامہ طنطاوی جوہری کی "تفسیر جواہر" کا بھی ایک ورق ملاحظہ فرما ہی لیجئے:۔

تم قرآن مجید کی یہ آیت لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمہارے لئے رسول اللہ کے اندر بہترین نمونہ ہے) مولویوں کے نزدیک رکھ دو۔ پھر ان سے جنگی ہتھیاروں کے متعلق فتوی پوچھو۔ ایک صاحب کہیں گے کہ ہمارے لئے رسول اللہ کے اندر بہترین اسوہ تھا۔ ہم خدا اور اس کے رسول کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلعم نے نیزہ اور تلوار سے جنگ کی ہے لہذا جنگ کے اندر دوسرے ہتھیاروں کا استعمال کرنا بالکل حرام ہے۔ جیسا کہ علماء ترکستان کے متعلق تجھے خبر ملی ہے کہ امیر بخارا نے جنگ کے آلات کے متعلق ان سے فتوی پوچھا تو انھوں نے وہی جواب دیا جس کو میں نے ابھی اوپر ایک مولوی کی زبان سے نقل کیا ہے۔ یہانتک کہ اس تاجر کے قتل کا فتوی دیدیا جو روس سے آیا تھا اور جس نے یہ کہا تھا کہ دوسری قومیں آجکل توپ وغیرہ سے لڑتی ہیں لہذا تم کو بھی ان کی تقلید کرنی چاہئے۔ آخر اس فتوی کا یہ نتیجہ ہوا کہ پانچ سال کے بعد روسی، بخارا کے اندر داخل ہو گئے۔

دوسرے مولوی صاحب فرمائیں گے کہ ہرگز نہیں، ہم کو اللہ اور رسول پر توکل کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آنحضرتؐ کو توکل کا حکم دیا ہے لہذا ہم کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔

تیسرے مولوی صاحب فرمائیں گے کہ یہ فتوی بھی غلط ہے بلکہ ہم کو "بخاری شریف" اور "سورہ یٰسین" پڑھنا چاہئے۔ ان کی برکت سے تمام دشمن خود بخود لپسپا ہو جائیں گے۔ آج سے دس سال پہلے ایک جنگ میں مسلمانوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہ فتوی بزدل اور بیوقوف مولویوں کا ہے تو پھر؟ جواب یہ ہے کہ

. . . . . اوپر کے تینوں فتوے غلط ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمن کے ساتھ ان ہی ہتھیاروں اور آلات سے جنگ کرتے تھے جن کو لیکر آپ کے دشمن مقابلے میں آتے تھے۔ اگر آپ کے دشمن توپ، بندوق اور ہوائی جہازوں سے آپ سے مقابلہ کرتے تو یقیناً آپ بھی ان ہی ہتھیاروں اور آلات سے مقابلہ کرتے۔ لہذا مسلمانوں کو تمام موجودہ آلات جنگ سے آراستہ ہو جانا چاہئے۔ . . . (جلد اول ص۹۳)

بہر حال ،تو اب صورت حال یہ ہے کہ اگر "مولوی" کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ قرآن کریم کو ہم نہیں سمجھ سکتے اور جو کچھ ہمارے مفسرین نے پہلے سمجھا تھا وہی درست ہے اور اس میں کلام کی گنجائش نہیں۔ تو ہمارے مفسرین نے جو کچھ قرآن سمجھا اور سمجھایا تھا اس وقت اس کے بالکل برعکس اور خلاف ظاہر ہوا ہے۔ لہٰذا ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ (نعوذ باللہ) قرآن "کلام الٰہی" نہیں ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن کے قول اور فیصلہ کے خلاف کسی واقعہ کا ظہور کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور جب ایسا ہو چکا ہے جس کی تکذیب و تردید نہیں کی جا سکتی اور (علماء کے قول کے مطابق) قرآن میں ایسا قیامت تک نہ ہونا بھی مذکور ہو چکا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا کا تو کلام نہیں ہے —— لیکن اگر ہم واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن حقیقتاً خدائے بزرگ و برتر کا کلام ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ

انہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ. تنزیل من حکیم حمید:- ( )

یعنی با وقعت کتاب ہی جس میں کوئی غلط بات نہ اس کے آگے سے آ سکتی ہے اور نہ پیچھے کی طرف سے کیونکہ یہ خدائے حمید کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

تو پھر ہم کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہم کو صدیوں سے جس طرح اور جیسا کچھ قرآن سمجھایا گیا تھا وہ ہمارے درد کا درماں نہیں ہے اسلئے ہمیں آج تقلید کی پٹی کو آنکھوں سے اتار کر، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کریم کو خود سمجھنا چاہئے۔ کہ

یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

کیا آپ نے طلوع اسلام کا نیا پتہ نوٹ فرما لیا ہے؟

طلوع اسلام کا نیا پتہ

دفتر ادارہ طلوع اسلام۔ بندر روڈ۔ چوک سول ہسپتال۔ کراچی

ہے

کیا آپ کو اپنا نمبر خریداری یاد ہے؟

طلوع اسلام سے خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے

ورنہ ادارہ تعمیل ارشاد سے معذور ہو گا۔